تا امید و یاس را پیچیدہ باہم دیدہ ام
صبح شادی را طلوع از شام ماتم دیدہ ام
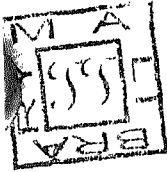
مشک و عود

از

محترمہ آمنہ محمودہ صاحبہ رضویہ

مصنفہ

دردانہ، لالہ زار، سوز و ساز، نامۂ تہدید، ارمغان کہکشاں

۱۵ جولائی سنہ ۱۹۵۳ء

بار اول — قیمت ڈیڑھ روپیہ

باہتمام آصف جاہ کاروانی۔ ایم۔ اے
ہندوستانی دارالاشاعت انجمن ترقی اردو کراچی سے شایع ہوا

اِنتساب

مظلوم کے جذبۂ انتقام کے نام

مندرجات

شکست

لطفِ خلش ہو ختم کیوں
زخمِ جگر کو چھیڑ دوں
نشترِ غم خرید لوں

ہے کوئی نشتر فروش

وہ شب چہاردہم! کائنات کسی خوش نصیب کے طالع کی درخشاں تھی اور غیر معمولی طور پر روشن مسکراتی ہوئی قیماں کرنیں پتّوں سے چھن چھن کر اس طرح گرتیں جیسے کائنات پر نورانی ابر برس برس رہا ہو۔

ہوا نشہ میلی سرسراہٹ سے پتّوں میں چھپی چھپی چل رہی تھی شوخ ستارے آنکھ مچولی کھیل رہے تھے اور دور سے سنائی دینے والے نغمے کی گونج ماحول کو اور بھی پُرکیف بنا دیتی۔

لیکن ایسے نشاط انگیز وقت میں بھی انجم بہت افسردہ تھی جس کا ثبوت اس کی دل فریب مسکراہٹ کی غیر موجودگی

تھی اور متبسم چہرے پر غلبۂ یاس۔

وہ کبھی کبھی ایک مغموم انداز سے دریچے سے باہر جھانک لیتی یا گاہے گاہے اپنے نازک ہاتھوں سے خوشنما سر کو تھام لیتی تھی جیسے تفکرات کے بڑھتے ہوئے بار سے کسی طرح نجات پا لینا چاہتی ہو۔ اُس نے اپنے گرد و پیش اک حسرت آلود نگاہ ڈالی اور نرگسی آنکھوں کو رومال سے صاف کرنے لگی جن میں صبح سے نہ معلوم کتنی مرتبہ اشک امڈ امڈ کر خشک ہو چکے تھے "آہ! آنے والی صبح نہ معلوم کس قدر مصائب کا انبار لے کر آئے"

وہ دل ہی دل میں سوچ رہی تھی "کیا مجھے اس مکان سے اس عزیز ترین مکان سے بھی علیحدہ کر دیا جائے گا۔ جہاں زندگی کے اس قدر سہانے خواب دفن ہیں جس کے گوشے گوشے سے محبت ہے اور در و دیوار سے اُلفت۔"

آسمان پر سفید سفید بادل لہرا رہے تھے بالکل اسی طرح انجم کے خیالات بھی چکر کاٹ رہے تھے اور خوشبوئیں فضا میں آوارہ خرام تھیں۔ اُس کی اداس روح کی طرح جو تخیل کی وادیوں میں کھوئی کھوئی پھر رہی تھی۔

(۲)

اور آنے والی صبح حقیقت میں مصائب کا انبار لیکر آئی

نواب شوکت مرحوم کی اچانک موت کیا کم تھی کہ اس پر مستزاد جائداد کی ضبطی جس نے انجم کو کچھ دیر کے لئے حواس و خرد سے بے نیاز کر دیا اور دہر کی وسعتوں میں بے یار و مددگار۔ نواب شوکت پرانی وضع کے ان رئیسوں میں سے تھے جو دولت کو ڈھلتی پھرتی چھاؤں سے زیادہ حیثیت نہیں دیتے۔ محض رواداری قائم رکھنے اور آرائش ظاہری پر ہی بے دریغ روپیہ لٹا دیتے ہیں تاہم یہ بھی غنیمت تھا کہ وہ اپنی اکلوتی دختر انجم آرا کی تعلیم و تربیت سے یک لمحہ غافل نہ رہے۔ یہی وجہ تھی کہ انجم نہ صرف مشرقی زبانوں پر پوری طرح سے عبور رکھتی تھی بلکہ انگریزی سے بھی بقدر ضرورت واقف تھی۔ وہ اک بلند اخلاق، پاکیزہ سیرت اور خوبصورت دوشیزہ تھی۔ حد سے زیادہ غیور و حساس اور اسم بامسمّیٰ انجم

اس نے فانی حیات کے تقریباً ۱۸ سال دنیا میں گزارے تھے لیکن اب تک یہاں کے نشیب و فراز سے ناآشنا تھی اور گردش آفاق سے بے خبر! اسے دہر اپنی ہی طرح معصوم نظر آتا اور اس کی ہر شے قابل توجہ۔

لیکن نواب شوکت کی ناگہانی موت نے اُسے دنیائے خواب سے اٹھا کر دہر میں لا بٹھایا۔ اب وہ ایک مقروض باپ کی بیٹی

تھی جس کی تمام جائیداد بھی قرضخواہوں کا مطالبہ پورا نہیں
کر سکتی تھی۔ ہر چہار طرف سے طعن و تشنیع کی بوچھار تھی اور اس
کی ناکردہ گناہ جان جسے مرحوم باپ کے گناہوں کا کفارہ ادا
کرنا تھا اور اس مکان کو جو کبھی اس کے لئے گہوارۂ عشرت
سے کم نہ تھا ہمیشہ ہمیشہ کے لئے خیرباد کہنا تھا تاکہ قرض خواہوں
کی اشک شوئی ہو سکے اور دنیا نواب شوکت اور راندۂ
درگاہ انجم کے نام تک کو بھول جائے۔

(۳)

سخت حیرت ہے! اور بیحد تعجب!! کہ دہر نے کس قدر
جلد اُسے فراموش کر دیا۔ سوسائٹی کی درخشاں فرد انجم کو
اجلاس اور پارٹیز کی روح رواں انجم کو۔ اور اب وہ اک گوشے
میں عرصۂ حیات پورا کر رہی تھی شہر کی لذتوں اور اس کی
دلچسپیوں سے بے نیاز۔

اس کے احساسات کی کونپلیں نہ معلوم کتنی بار اُبھریں
اور جھجک جھجک کر رہ گئیں تاہم اب محض ایک اُمید تھی۔ ایک
موہوم سا واہمہ! جو اس کی سوگوار زندگی میں اک ہلکی سی جھلک
پیدا کر دیتا اور مایوس دل کی گہرائیوں میں غائب ہو جاتا۔ اس

شہاب ثاقب کی طرح! جو کچھ دیر کے لئے فضا کو درخشاں کر کے اُس کی وسعتوں میں کھو جاتا ہے۔ اور وہ بھی شہاب مشہدی کی اپنی کی اُمید جو سال گزشتہ سے بغرض آئی سی ایس انگلینڈ میں مقیم تھے۔ بعض اوقات وہ یہ سوچ کر پاگل سی ہو جاتی کہ دنیا اور اُس کی وابستہ ہستیوں کی طرح شہاب بھی تو کہیں منہ نہ موڑ لیگا لیکن پھر وہی اُمید! وہی موہوم سی اُمید ڈھارس بندھاتی۔

اور پھر شہاب تھا بھی تو اس کا منگیتر! اس کا ہونے والا خدائے مجازی!! جسے نواب صاحب اپنے خرچ پر آئی سی ایس کرا رہے تھے۔ اس کا مستقبل کامیاب بنانے کی غرض سے اور انجم کی آئندہ زندگی کی بہبود کے لئے۔

شہاب نواب صاحب کے ایک جگری دوست کا فرزند تھا جس کی ذہانت و ذکاوت پر اگر باپ کو ناز تھا تو ہونیوالے سسر کو افتخار۔

انجم شہاب کو تمام حالات مفصل طور پر لکھ چکی تھی اور اب شدت سے اُس کی آمد کا انتظار کر رہی تھی تاکہ غم غلط کرنے کا کوئی ذریعہ ہاتھ آسکے اور اُس کی بھٹکتی ہوئی بیتاب روح سکون حاصل کرے۔

(۴)

اس آخری اُمید نے بھی ایک روز دم توڑ دیا۔ شہاب کے لئے تو اب زندگی کی ہر شاہراہ کھل چکی تھی۔ اگر نواب صاحب کا کچھ ڈر تھا تو وہ تو انتقال کر چکے تھے اور آنکھوں میں چکا چوند پیدا کر دینے والی دولت بھی تو نہیں رہی تھی جس کے سہارے پر انجم سے وابستہ ہونے میں اسے کچھ عذر نہ ہوتا۔ چنانچہ بے رحم اور شقی القلب شہاب نے صاف صاف لکھ دیا کہ "وہ آئندہ کے لئے انجم سے کوئی سروکار نہیں رکھنا چاہتا۔ ایک بدنام باپ کی بیٹی کے ساتھ زندگی گزارنا احمقانہ خیال ہے جس کے لئے وہ ہرگز تیار نہیں۔ اور انجم بھی خود مختار ہے۔ جونسی راہ اپنے لئے اختیار کرنا چاہے منتخب کر سکتی ہے۔ اُسے کوئی اعتراض نہ ہوگا"

جس وقت انجم نے یہ قلب و جگر کو ٹکڑے کر دینے والی تحریر پڑھی تو اسے ایسا معلوم ہوا جیسے پہلو میں دل کی دھڑکن بند ہو گئی ہے۔ آہ! کیا اسی بر نہ آنے والی آرزو کے پورا ہونے کی وہ منتظر تھی اور اب وہ حسین آنکھیں تقریباً ہر وقت اشک ریز رہنے لگیں اور دلفریب مسکراہٹ کی جگہ مستقل اور مایوس کن اداسی نے لے لی۔

اب اُسے معلوم ہو گیا کہ دنیا انجم کی قدردان نہ تھی وہ ظاہری ثروت تھی۔ زر کی جھنکار اور نواب صاحب کی موجودگی نے ہر ایک کو مرعوب کئے رکھتی۔ اور شہاب! اُف!! اُس کے متعلق رائے قائم کرنے میں انجم نے کس قدر غلطی کی۔ اس انسان کی واپسی کے لئے وہ کس شدومد سے سراپا انتظار تھی جو اُس کا نہیں محض اس کی جائداد کا خواہاں تھا۔ آج پہلی بار انجم نے صورت حال پر غور کیا کسی فیصلے پر پہنچنے میں اُسے کوئی خاص وقت نہیں ہوئی اب اس کا ارادہ مستحکم تھا اور فیصلہ چٹان کی طرح آہنی۔

اب وہ دنیا کا پوری طرح سے مقابلہ کرنے کو تیار تھی اور شہاب کے نام تک سے بیزار۔

(۵)

آنسہ اختر جمال کی قابلیت کا چرچا آج ہر تعلیم یافتہ گھرانے میں تھا۔ تنویر، خاتون، حجاب۔ نسوانی دنیا اور حریم جیسے مقتدر رسائل اس کی نگارشات زریں بہت افتخار سے شائع کرتے اور بڑے بڑے ادیب اُس کی تقلید کے متمنی رہتے اُس کی تحریر میں ایسا سحر تھا جو پڑھنے والوں کو گھنٹوں کے لئے مدہوش کر دیتا اور اپنے گردوپیش سے بے خبر۔ اُس کے ایک

ایک جملہ میں گداز تھا اور ہر سطر پُرسوز۔ ایسا معلوم ہوتا جیسے الم
کی دیوی اپنے بربط پر کوئی غمگین راگ چھیڑے ہوئے ہے۔

اُس کی بلند خیالی اور عالی دماغی ہزاروں کے لئے
باعث حیرت تھی اور پرواز تخیل کا ہر کوئی معترف یہی نہیں
بلکہ گزشتہ چھ سال کے عرصے میں وہ کم از کم ایک درجن کتابیں
لکھ چکی تھی جنھوں نے ملک کے مختلف ادیبوں اور نقادوں
سے خراج تحسین حاصل کیا تھا۔ ہر صبح تعریفی خطوط کا ایک انبار
اُس کی میز پر جمع ہو جاتا ہر علمی و ادبی مجلس اُس کے بغیر تشنہ
سمجھی جاتی اور جس جلسہ میں اُس کی تقریر نہ ہوتی وہ ناکامیاب
رہتا۔ اُس کی زبان و قلم سے نکلے ہوئے الفاظ اتنی مرتبہ دہرائے
جاتے کہ وہ لوگوں کو ازبر ہو جاتے لیکن اس پر بھی ہوس
بڑھتی ہی جاتی۔ سب کا قیاس تھا کہ اس قدر شہرت اور قابلیت
کی مالک خاتون کی زندگی آرام سے گزر رہی ہو گی اُس کے
چہار طرف طمانیت کا دور دورہ ہوگا اور راحت قلبی کا حصار ہے۔

لیکن نہیں۔ اختر جمال کے پردے میں پوشیدہ انجم
آج تک روحانی سکون حاصل کرنے سے محروم رہی۔ اس کے
کاہیدہ جسم کا رواں رواں جو شباب کے خلاف بھڑک اُٹھا تھا

آج تک صدائے ماتم ہی بلند کرتا رہا۔ اپنی بے بسی کا خیال اب بھی اُسے غرقِ الم کر دیتا تھا جس کا ثبوت وہ سوز و گداز میں ڈوبے ہوئے شاہ پارے تھے یا خوبصورت آنکھوں میں لرزتے ہوئے آنسو۔ جن پر وہ چھ سال کے طویل عرصہ میں بھی قابو نہ پا سکی تھی

(۶)

آج شہاب کو ڈاک کا شدت سے انتظار تھا۔ نگاہیں بار بار دروازہ پر جا کر لوٹ آتیں۔ اک حالتِ اضطرار میں سینکڑوں بار کمرے کا طواف کر چکا تھا لیکن ابھی تک پوسٹ مین نہیں آیا تھا۔ اُس کی یہ اضطرابی کیفیت بالکل بجا تھی اور بے چینی درست گزشتہ دو سال سے آنسہ اختر جمال کی تحریر اُس کا مرکزِ نگاہ بنی ہوئی تھی۔ اور اب! اب!! تو یہ شوق بڑھتے بڑھتے جنون کی حد تک پہنچ گیا تھا "ہندوستان میں بھی اس قدر اعلیٰ تخیل کی خواتین موجود ہیں" یہ خیال کبھی اُس کے ذہن میں بھی نہ آیا تھا۔

یہی وجہ تھی کہ وہ اختر جمال کو خط لکھنا چاہتا لیکن الفاظ تخاطب کو اس باب میں معذور پا کر خاموش رہ جاتا۔ تحریر کی عمومیت اسے درجۂ نیازمندی سے پست ہو جانے کا احساس دلاتی۔ اس لئے وہ خط لکھنے کا متمنی ہوتے ہوئے بھی آج تک

یہ جسارت نہ کر سکا لیکن گزشتہ ہفتہ "حجاب" میں اختر جمال کا جو شہپارہ شایع ہوا تھا اس کی ادبیت و نگارش زرّیں نے شہاب کو کچھ اس حد تک مجبور کیا کہ اس نے ان ادبی کاوشوں کو سراہتے ہوئے ڈرتے ڈرتے آخر اک خط لکھ ہی دیا ساتھ ہی یہ بھی لکھا کہ میری بے اختیاری لائق تعزیر نہیں بلکہ قابل رحم ہے اس لئے اگر اجازت ہو تو شرف ملاقات بھی حاصل کیا جائے۔

چنانچہ آج کی ڈاک سے اُسے اختر کے جواب کا انتظار تھا" کہ اس تحریر کا اس پر کیا اثر ہوا ہو گا۔ آیا میری التماس قابل توجہ بھی جائے گی یا ردی کی ٹوکری میں جگہ پائے گی"

اسی اُدھیڑ بُن میں نہ معلوم کب تک کھویا کھویا رہتا کہ ملازم نے خطوط لا کر پیش کیے۔ شہاب نے دھڑکتے ہوئے دل سے انھیں اُلٹ پلٹ کر دیکھا اور اک ننھا سا معطر لفافہ اُس کے مرتعش ہاتھوں سے کئی بار گرتے گرتے بچا۔ اس کا طرز تحریر نسوانی تھا اور نازک و اجنبی ہاتھوں کا تحریر کردہ۔

شہاب سے ملنے پر اختر جمال کو کچھ اعتراض نہ تھا بلکہ اُس سے ملاقات کرنا وہ اپنی خوش قسمتی خیال کرے گی

اس خلاف توقع تحریر سے وہ بیحد مسرور ہوا۔ کائنات اب اس کے لئے قوس و قزح سے بڑھکر حسین تھی۔ اس کے مناظر خواب کی طرح جمیل! اور ذرہ ذرہ شفق سے زیادہ دل آویز۔

(۶)

اب خواہش لذات نہیں ہو سکتی   اب ان کے سوا رات نہیں ہو سکتی
دکس لئے کھٹکا سا لگا ہے دنیا   کہہ دو کہ ملاقات نہیں ہو سکتی

اس شام جب شفق کی شعاعیں دنیا کی تجلیوں کو اپنے دامن میں سمیٹ رہی تھیں اور بادلوں پر شام کی سرخی چھا رہی تھی مسٹر شہاب مشہدی آئی سی۔ ایس اپنے سامنے اختر جمال کے بجائے انجم کو دیکھ کر دم بخود رہ گئے ......
اور سخت حیران و نادم۔

اور اس پراسرار سکوت کو انجم کے ان الفاظ نے توڑا
"آپ مجھے دیکھ کر ناامید ہو گئے ہیں شاید ہ لیکن جب عورت کی اپنی کوئی ہستی ہی نہیں تو خواہ کسی بھی نام سے ظاہر ہو اس میں دلچسپی لینا چہ معنی دارد؟ وہ رہتی تو ہر صورت میں عورت ہی ہے بے کس۔ بے بس اور بے دست و پا عورت۔
"میں پشیمان ہوں انجم!" شہاب لڑکھڑاتے الفاظ میں

بولے "مجھے اپنی غلطی پر سخت افسوس ہے اور اس رویہ پر ندامت"

"اس میں پشیمانی کی بات ہی کیا ہے؟ آپ تو ایک معروف ادیب اختر جمال سے ملنے کے لئے تشریف لائے تھے نہ کہ مجھ سے"

"انجم! انجم!! ذرا سنو تو"

"ٹھہرئیے" انجم قطع کلام کرتی ہوئی بولی "آج سے چھ سال پیشتر مقروض باپ کی بیٹی سمجھ کر آپ نے انجم کو ٹھکرا دیا اور خوش تھے کہ دنیا نے اسے بھلا دیا۔ شہاب ایسا کرنے میں حق بجانب تھے کیونکہ انجم کے پاس انھیں متوجہ رکھنے کو زر و مال نہ رہا تھا لیکن سوسائٹی کو تو آخر قبول کرنا ہی پڑا۔ خواہ دنیائے صحافت میں ہی سہی اور اختر جمال کے نام سے"

"بس کرو انجم! خدا کے لئے ان باتوں کو بھول جاؤ مجھے اپنی "شکست" کا اعتراف ہے سچے دل سے اعتراف"

"لیکن میری شکست کے داعی بھی تو آپ ہی تھے"

"اس کا کفارہ ادا کرنے کو تیار ہوں اور وہ اس طرح کہ تم میری درخواست کو منظور کر لو اور حسب سابق مجھے اپنا بنا لو۔ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے"

"کیا ایک پاش پاش دل کو آپ اس طرح جوڑنا چاہتے ہیں

لیکن یہ ناممکن ہے قطعی ناممکن !! نسوانی خودداری اسے کبھی نہیں برداشت کر سکتی۔ انجم کو ٹھکرا کر آپ مجھے اختر کی حیثیت میں کبھی حاصل نہیں کر سکتے"

"لیکن اس وقت تو میں انجم کا ہی خواستگار ہوں"

"ہو سکتا ہے مگر اب انجم آپ کی نہیں ہو سکتی میری زندگی کو تلخ بنانے والے آپ ہی تھے۔ اب اس حقیقت کی تہہ تک بھی آپ ہی کو پہنچنا چاہیئے "شکست" کا اعتراف بے وقت ہے اور بے سود! بہرحال آپ تشریف لے جا سکتے ہیں۔ خدا حافظ"

اور آخری مرتبہ ان ستاروں جیسی حسین آنکھوں میں آنسو لرزے اور پلکوں میں جذب ہو کر رہ گئے۔ انجم کو ایسا معلوم ہوا کہ اسکے دل کی گرہ کھل گئی ہے۔ وہ نامعلوم سی خلش جس نے اُسے برسوں بیچین رکھا اب سکون پذیر تھی اور روح مائل بہ طمانیت۔ رات درخشاں تھی اور جلوہ ساماں۔ سیمیں کرنیں وفور مسرت سے لڑکھڑا رہی تھیں اور ستارے پھولوں کی طرح کھلے ہوئے تھے لیکن شہاب کو ہر طرف دھندلکے کا غلبہ نظر آتا تھا اور فضا ظلمت بداماں۔ ہوا کی سرسراہٹ سے شیشم کے درخت چیخ رہے تھے جیسے سسکی اور ہچکی پر آمادہ اشتراک ہوں اور ماہ شب مسکرا مسکرا کر اسکی شکست کا اشتہار

اعتراف پندار

بہار کی وہ چمکیلی صبح اتبسم برق جیسی دلفریب تھی اور تصور شاعر کے مانند حسین! نسیم سحر شرمیلی کلیوں سے سرگوشی کے لہجے میں کچھ کہہ رہی تھی اور فضاؤں میں نارنگی کی کلیوں کی ہلکی ہلکی بو بس رہی تھی۔ کائنات مسرور و متبسم تھی! ایسا تبسم جیسے سالہاسال کے بعد مینہ برسا ہو۔

خوش رنگ بادلوں کے ہجوم سے مسکراتا ہوا آفتاب جھانک رہا تھا کسی شریر بچے کی طرح! جس میں شوخی کے ساتھ ساتھ معصومیت کا رنگ بھی ملا ہوا ہو۔

سر ظفر سلیم آج بیدار ہوئے تو طبیعت موسم بہار کی طرح شگفتہ تھی اور دل فرط مسرت سے معمور۔ انھوں نے اک عالم سرور میں کمرۂ خواب کے گرد و پیش نگاہ دوڑائی اور شام کی دعوت کے اہتمام کے لئے کمر بستہ ہو گئے۔

"سر بننے کی خوشی میں ظفر صاحب، آج کمشنر صاحب کو مدعو کر رہے تھے اور اُن کے ساتھ ہی جملہ احباب کو بھی۔ آخر یہ

ان حضرات کا ہی تو طفیل تھا کہ انھیں اپنے مقصد میں اس قدر جلد کامیابی ہو گئی ورنہ اُن کے ہم عصر تو آج تک اس اعزاز کے لئے مر تو ڑ کوشش کرتے رہے اور نتیجہ اب تک صفر ہی رہا

ظفر لاج کسی عروس نو کی طرح سجی ہوئی تھی اور ہوتی بھی کیونکر نہ جب کہ اس کی آرائش پر پانی کی طرح روپیہ بہایا گیا تھا۔ کوٹھی کی اندرونی سجاوٹ ہر طرح قابل اطمینان تھی اسلئے آپ باغیچہ پر بھی اک تنقیدی نظر ڈالنے کے ارادے سے نکلے۔

دروازے پر ہی بوڑھا دربان شکور کھڑا تھا اُس کے تھکے تھکے انداز اور سُرخ سُرخ آنکھوں سے عیاں تھا کہ وہ مسلسل کئی راتوں سے سو نہیں سکا ہے۔ اور چہرے کی پژمردگی کسی نہاں الم کا پتا دے رہی تھی۔

سلیم کو دیکھ کر اُس نے کچھ کہنے کی جرأت کرنی چاہی لیکن سوائے "سرکار" کے آگے کچھ نہ کہہ سکا جیسے الفاظ حلق میں اٹک کے رہ گئے ہوں

"کیا ہے" سلیم صاحب نے آشفتگی سے بولے" اور تم نے اب تک وردی کیوں نہیں پہنی۔ کیا اتنا نہیں جانتے کہ کمشنر صاحب آ رہے ہیں"

"لیکن سرکار! میں تو چھٹی لینے آیا تھا۔ لڑکے کی طبیعت کئی روز سے اچھی نہیں تھی۔ آج تو حالت بالکل ہی خراب ہے"

"اس سے ہمیں کیا؟ لیکن آج تو تم کسی طرح بھی غیر حاضر نہیں رہ سکتے ورنہ تمام تنخواہ کاٹ لی جائے گی"

"لیکن حضور! اُس کے پاس تو کوئی بھی نہیں"

"تو پھر ہم کیا کریں" سلیم صاحب خشمگین ہو کر بولے "کمبخت کو آج ہی بیمار ہونا تھا کیا۔ تمھیں آج کسی صورت میں بھی جانے کی اجازت نہیں ہے۔ خلاف ورزی ہوئی تو نتیجہ اچھا نہ ہوگا"

"بیچارہ شکور پھر اُٹھا۔ مسٹر سلیم کی ظالم جابر اور اکھڑ طبیعت سے وہ پوری طرح واقف تھا۔ تمام ملازم اُن کے جور و ستم کے ہاتھوں نالاں تھے اور مزاج کا اندازہ لگا کر بات کرتے بچے کا خیال آتے ہی اُس کی روح پر افسردگی چھا گئی لیکن ایسی التجاؤں کو ٹھکرا دینا تو مسٹر سلیم کے لئے پیش پا اُفتادہ تھا بیچارہ مچلتے ہوئے آنسوؤں کو ضبط کر کے رہ گیا۔

دعوت کامیاب رہی۔ مسٹر سلیم کے تخیل سے بڑھ کر کامیاب یہاں تک کہ جب کمشنر صاحب نے بھی روانگی کے وقت کہا کہ میں نے بہت کم ہندوستانی دعوتیں ایسی شاندار دیکھی ہیں تو اُن کی زندگی کے تار پر مسرت نغموں کی لے سے [illegible] اور

دوستوں کی مبارکباد کے شور سے تو روح کے پٹ کھلے جا رہے تھے
اب تمام اصحاب رفتہ رفتہ جا چکے تھے صرف چند بیفکرے
باقی رہ گئے تھے اور وہی اس یادگار دعوت کے تذکرے
جنھیں سُن سُن کر سر سلیم وجد میں آ رہے تھے کہ دفعتاً ایک ملازم
گھبرایا ہوا آیا اور اُن کے سب سے چھوٹے بچے اظہر کے اچانک
سیڑھیوں پر سے گر جانے کی اطلاع دی۔

اس قدر جابر ہوتے ہوئے بھی سر سلیم کو اپنے
بچوں سے اُلفت تھی خاص کر ننھے اظہر پر تو جان چھڑکتے اور
اس کی ایک ایک مسحور کُن ادا سے بیحد لطف اندوز ہوتے

ملازم سے یہ سُنتے ہی گھبرائے ہوئے اُٹھے۔ اندر
جا کر دیکھا تو بچہ واقعی بُری طرح چوٹ کھا گیا تھا خاص کر پیشانی
کا زخم بہت گہرا تھا اور چار برس کی ننھی جان کے لئے
یہ تکلیف ناقابل برداشت۔ ڈاکٹروں کا تانتا بندھ گیا ہر
ممکن کوشش خون بند کرنے کی جا رہی تھی یہاں تک
کہ بچہ نڈھال ہو کر بیہوش ہو گیا

سر سلیم کے ہاتھوں کے طوطے اُڑ گئے۔ اُس پر
مستزاد صاحب سرجن کا یہ کہنا کہ اگر آدھ گھنٹے کے اندر اندر

بچے کو ہوش نہ آیا تو پھر ہماری ہر سعی بے کار ہے

فکرمند نگاہیں معصوم چہرے پر پڑ رہی تھیں جو لمحہ بہ لمحہ زرد تر ہوتا جاتا اور اس کے ساتھ ہی صاحب سرجن کی تشویش بھی بڑھ رہی تھی۔ وقت پورا ہونے میں اب صرف دس منٹ باقی تھے لیکن ہوش کے آثار نظر ہی نہ آتے دس سے صرف پانچ منٹ رہ گئے مگر بچہ اسی طرح بیہوش تھا

سرسلیم اس سے زیادہ ضبط نہ کر سکے وہ ننھے اظہر کی طرف بڑھنے ہی کو تھے کہ معاً کچھ یاد آ گیا اور پیچھے کھڑے ہوئے ملازم سے شکور کی بابت دریافت کیا۔

"سرکار! وہ تو ڈیوٹی ختم ہوتے ہی چلا گیا تھا۔ اس کا بچہ بیچارہ بھی بہت ......"

ان کی فطرت سے واقف ملازم آگے جملہ پورا نہ کر سکا

"تمہیں اس کے مکان کی خبر ہے" سرسلیم نرمی سے بولے

"جی سرکار" اور ملازم نے حیرانی سے اپنے آقا کی طرف دیکھا جو اسسٹنٹ ڈاکٹر کو اپنے ہمراہ چلنے کے لئے کہہ رہے تھے

سب تعجب میں تھے کہ بچے کو اس نازک حالت میں چھوڑ کر کہاں جا رہے ہیں لیکن کسی کی جرأت ہی نہ تھی کہ کچھ

دریافت کر سکے یہاں تک کہ وہ مع ملازم و ڈاکٹر کار تک جا چکے تھے

شکور کے ٹوٹے پھوٹے جھونپڑے تک پہنچنے میں چند منٹ
سے زیادہ عرصہ نہ لگا لیکن سر سلیم کے لئے تو یہ بھی گھنٹوں سے کم نہ تھا
اُن کا ضمیر آج بُری طرح ملامت کر رہا تھا وہ شکور کے ساتھ اپنے
اس جارحانہ سلوک پر نادم تھے اور بُری طرح شرمندہ۔

بیچارہ شکور اپنے بیمار فرزند کے سرھانے بیٹھا رو رہا
تھا اُس کی مایوس نگاہوں نے آتے ہی بچے کی حالت کا جائزہ
لے لیا تھا۔ اور اب وہ تھا یا ہجوم تفکرات ...... کہ سر سلیم
اندر داخل ہوئے لیکن اس عالم میں کہ آنکھیں جھکی ہوئی
تھیں اور قدموں میں لغزش تھی۔

شکور لڑکھڑا سا گیا۔ اُسے خواب میں بھی یہ
خیال نہ آسکتا تھا کہ کبھی ایسا بھی ہو سکتا ہے لیکن سر سلیم آگے
بڑھے۔ اُن کی آنکھوں میں آنسو تھے اور لبوں پر یہ الفاظ
"شکور! میرے عزیز شکور!! میرے آج کے گناہ کو معاف
کرو۔ مجھے اس کا بدلہ مل چکا ہے"

"سرکار! یہ آپ کیا فرماتے ہیں۔ خادم تو ہر طرح خادم ہے"

"نہیں شکور! کہو کہ تم نے مجھے معاف کیا سچے دل سے"

معاف کیا ورنہ کبھی مجھے چین اور سکون نصیب نہ ہوگا اور میرا اظہر آہ! وہ۔ وہ" اور جملہ پورا ہونے سے پیشتر ہی سر سلیم پھوٹ پھوٹ کر رو رہے تھے۔

"چھوٹے سرکار کو کیا ہوا" شکور نے بےچین ہو کر دریافت کیا اور دوسرے ملازم سے پوری کیفیت سُن کر تصویرِ حیرت ہو کر رہ گیا

"کیوں شکور! کیا میرا جرم قابلِ تلافی نہیں؟" سر سلیم افسردگی سے بولے "ڈاکٹر صاحب تمہارے بچے کو دیکھنے کے لئے آئے ہیں، تم اپنی دعا سے میرے اظہر کی جان بچا لو"

اور کیسا پُر اثر تھا وہ وقت بھی جب ملازم و آقا دونوں گڑگڑا گڑگڑا کر مصروفِ دعا تھے اور درِ قبولیت وا ہونے کے منتظر۔ اسسٹنٹ ڈاکٹر شکور کے بچے کو دیکھ ہی رہا تھا کہ ظفر لاج سے ایک اور ملازم یہ خوشخبری لایا کہ تمام ڈاکٹروں کے خلافِ توقع بچہ خود بخود پوری طرح ہوش میں آچکا ہے اور اب خطرے سے باہر ہے"

"شکور" سلیم صاحب بولے "تم نے دعا مانگ کر جو احسانِ عظیم کیا ہے اس کا بدلہ دینے سے تو میں قاصر ہوں لیکن یقین جانو کہ آج کے واقعہ سے میری کایا پلٹ ہوگئی ہے"

بچہ دشکور کے لڑکے کی طرف اشارہ کرکے) اظہر کے ساتھ ہی پرورش پائیگا۔ یہ میرا نجات دہندہ ہے اور اس بہت بڑی تبدیلی کا باعث اور بہار کی اس خنک اور چاندنی رات کو جبکہ کائنات پرسکوت تھی اور ماحول نشاط انگیز، مسٹر سلیم تصور ہی تصور میں اس دنیا کی سیر کر رہے تھے جسے انسانی آرزوئیں صرف خواب ہی میں دیکھ سکتی ہیں۔ اُن کی روح مسرور تھی اور قلب بخنت و متشفی۔ دولت و امارت کے غرور کو خیرباد کہہ کر انھوں نے رازِ حیات پالیا تھا۔ وہ رازِ حیات جو کسی مفلس، غریب بیکس اور بے بس کے دل کی دھڑکن میں پوشیدہ ہے اور اُسکی افسردہ نگاہوں میں چمک چمک کر چھپ جاتا ہے۔

"کیوں جناب! آپ کہاں چلے گئے تھے" سول سرجن نے بچّے کی جان بچ جانے پر مبارکباد دے کر کہا۔

"اعتراف پندار کے لئے" مسٹر سلیم نے مسکراتے ہوئے جواب دیا اور معصوم اظہر کو اپنے بازوؤں میں لے کر پیار کرنے لگے

---
*

آسماں بدلا کرے رنگ اور میں دیکھا کروں
اے شکستِ ساغرِ امید ! آخر کیا کروں ؟
یا تو مر مر کر دلِ بے مدعا پیدا کروں
یا گلہ کچھ اپنی اس بے دست و پائی کا کروں

ستمبر کی وہ افسردہ سی سہ پہر! ہر چہار طرف خزاں کا دور دورہ تھا۔ لمحاتِ کائنات پر اک پُر اسرار اُداسی چھا رہی تھی۔ بے جان پھول شاخوں سے ٹوٹ ٹوٹ کر گر رہے تھے اور سوکھی ٹہنیاں بہار کا ماتم کر رہی تھیں
لیکن ایسا اُداس ماحول بھی ان دو روحوں کی مسرتیں کم کرنے سے معذور تھا جو اک ننھے سے معصوم بچے کا جھولا جھلاتے ہوئے فردوسی خواب دیکھ رہی تھیں۔ دنیا و مافیہا سے بے خبر اور گرد و پیش سے بے نیاز۔

ان کی دنیا تو بس اس معصوم ہستی تک محدود ہو کر رہ گئی تھی اور دلچسپیوں پر اُس کے پاکیزہ تبسم نے حصار کر لیا تھا۔

"سلمیٰ! ہم بے حد خوش قسمت ہیں کہ قدرت نے آخر ہماری بے بسی پر رحم کیا اور ایسا پیارا کھلونا عطا کیا ہے" جمیل لہجۂ انبساط میں بولا "ذرا اس کی شفاف پیشانی تو دیکھو۔ کیسی مدبرانہ کیسی خوش نصیب کے طالع کی طرح روشن اور کیسی باصفا ہے"

"اور آنکھوں کو تو آپ نے نظر انداز ہی کر دیا" سلمیٰ نے بے صبری سے کہا "ذرا غور سے دیکھئے کیسی حسین اور ستارے کی طرح درخشاں ہیں۔ انشاء اللہ! اس بچے کے طفیل ہمارا مستقبل بھی ایسا ہی درخشاں اور کامیاب ہوگا"

"اس میں شک ہی کیا ہے؟ اس کی پیدائش کے روز ہی تو اس کا ثبوت مل چکا ہے جب ہمارے افسر نے مجھے دوبارہ بلا کر اسی جگہ بحال کر دیا ورنہ میں تو سمجھتا تھا کہ دو وقت کی روکھی سوکھی کھانے کو مل جاتی تھی آئندہ کیلئے اُس سے بھی گئے"

"اور میری چوڑیوں والی بات بھی یاد ہے آپ کو؟ وہ بھی تو اُسی روز کسی تصویر کے پیچھے سے ملی تھیں حالانکہ میں تو چپہ چپہ تلاش کر کے نا اُمید ہو چکی تھی"۔

"میرا دل گواہی دے رہا ہے کہ ہمارا اکور بڑا ہو کر بیرسٹر بنیگا۔ اتنا بڑا سا سر تو کسی بڑے آدمی کو ہی ودلیت ہوا کرتا ہے"

"لیکن ڈاکٹر بننے میں کیا ہرج ہے۔ اُف جمیل! یہ امر ہمارے لئے کس قدر باعثِ مسرت ہوگا سمجھو جب ہم بوڑھے ہوجائیں گے تو یہ ہماری معمولی سی تکلیف پر کس طرح بے چین ہوجایا کرے گا اور کس کاوش سے ہمارا علاج کرے گا"

یہ تھیں دو پُر اشتیاق دلوں کی بے قرار آرزوئیں جن کی تکمیل کی اُمید میں وہ کشاکشِ حیات سے نبرد رہے تھے اور یہ تھے وہ سہانے اور پُر کیف خواب! جن کی تعبیر کی آس میں عُسرت کے بے کیف دن گزر تے جارہے تھے

دسیوں برس یوں ہی خزاں کا تسلط ہوتا استبداد کے وحشی ہاتھ کائنات کو کسی دیوانے مصوّر کی بے ڈھنگی تصویر کی ہیئت میں تبدیل کردیتے اور پتے حسبِ معمول شاخوں سے جھڑتے رہتے۔

لیکن سلمیٰ و جمیل اُس وقت کے منتظر تھے جب اُن کی بہارِ حیات پر دائمی شادابی کی مُہر ثبت ہوجائے گی۔ انھیں اس دورِ نہاں کا انتظار تھا جب اُن کی عُسرت مبدّل

بہ عشرت ہو جائے گی۔ صاحب نصیب اور اقبالمند فرزند کا وجود
اُن کی زندگی میں حرارت پیدا کر دیتا اور اُس کے ساتھ ساتھ
اُن کی آرزوئیں بڑھ رہی تھیں تمنائیں پرورش پا رہی تھیں
اور حسرتیں پوری ہونے کی منتظر تھیں

باہر بچوں میں کھیلتے کھیلتے انور کو بھی اسی قسم کے خواب
یاد آتے رہتے۔ وہ بھاگا بھاگا آکر ماں سے لپٹ جاتا اور
بچپن کے طفلانہ لہجے میں کہتا "امّی! آپ ہر وقت گھر کا کام
کیوں کرتی رہتی ہیں کوئی ملازم کیوں نہیں رکھ لیتیں مجھے یہ اچھا
نہیں معلوم ہوتا کہ شوکت، سرور اور عابد کی مائیں تو تمام دن
بیٹھی رہیں اور میری امّی ہر وقت کوئی نہ کوئی کام کرتی رہے"

"ملازم کے لئے پیسے کہاں سے لائیں بیٹا! شوکت سرور
کے والدین تو امیر ہیں ہم اُن کا مقابلہ کہاں کر سکتے ہیں"

"تو کیا ہم امیر نہیں بن سکتے امّی! ہم ملازم نہیں رکھ سکتے؟"

"رکھ کیوں نہیں سکتے لیکن یہ کام تو دولتمندوں کے ہیں"

"اوہ! تم اس کی فکر نہ کرو" انور افتخار سے سر بلند
کرتے ہوئے کہتا "مجھے ذرا بڑا ہو جانے دو۔ پھر دیکھنا کس قدر
روپے تمھارے لئے لایا کرونگا۔ ابّا سے بھی زیادہ اور قیمتی

قیمتی زیور اور کپڑے" خدا وہ دن جلد سے جلد لائے!" اسلئے
دونوں ہاتھ دُعا کے لئے اُٹھا کر کہتی اور خوابوں کی دنیا میں
کھو جاتی۔ سُنہرے سُنہرے سپنوں کی دنیا میں
" ابا! آپ تمام دن دفتر میں کیوں رہتے ہیں؟"
انور کبھی کبھی باپ سے دریافت کرتا
" بیٹا! دفتر نہ جائیں تو تمھارے لئے کھانے کو کہاں سے آئے"
"میں بیرسٹر بن کر آپ کو ہر روز بہت سے روپے لادیا کرونگا"
"ضرور! بیٹا!! اسی آرزو میں تو ہم گن
گن کر روز و شب گزار رہے ہیں"
بارہا انور دل ہی دل میں یہ سوچ کر متوحش ہو جاتا کہ
جو آرزوئیں میری زندگی کا مقصدِ ثانی بن چکی ہیں وہ کہیں
اس قدر بڑی نہ ہوں کہ کبھی پوری ہی نہ ہو سکیں لیکن اسوقت
اسے امی کی دعاؤں اور ابا کی تمناؤں کا خیال آجاتا ڈگمگاتی
کانپتی اور لرزتی اُمیدیں پھر صراطِ مستقیم پر چلنے لگتیں اور وہ
گھنٹوں مستقبل کی ایک دنیا بناتا رہتا
انتظار ہی انتظار میں آج پچیس برس گزر گئے۔ اس
عرصے میں کئی بار ان سہانے خوابوں کا سلسلہ ٹوٹتے

ٹوٹتے بچا اور یاس کی لہریں آس کے چھینٹوں میں تبدیل ہوتی رہیں
لیکن اب! آہ اب!! وہ حقیقت سے قریب تر ہوتے
جا رہے تھے۔ انور کی جو باتیں کچھ عرصہ پیشتر سلمیٰ کی اُمیدوں کو
سینچا کرتی تھیں اور جمیل تصور ہی تصور میں انھیں پورا
ہوتے دیکھ کر مسرور ہوا کرتا تھا اب سراب آسا ہو کر رہ گئی
تھیں۔ قطرۂ حباب کی طرح سراب آسا!! آہ وہ خیالی آرزوئیں
جو فضا میں اس طرح کھو کر رہ گئیں۔ جیسے آسمان سے کوئی تارا
ٹوٹے اور کائنات کی وسعتوں میں گھُل جائے۔

سلمیٰ سے اک عالی شان اور آراستہ مکان کا وعدہ
انور پورا نہ کر سکا نہ وہ قیمتی قیمتی زیور آئے جن کے ڈھیر وہ خوابوں میں
اپنی امی کے آگے لگا دیا کرتا تھا اور نہ ہی کوئی ملازمہ جو گھر کے کاموں
میں شفیق اماں کا ہاتھ بٹا سکتی۔ ابا کو ہر روز بہت سے روپے لا کر
دینے کا خواب۔ اُف وہ بھی اب خیال ہی خیال رہ گیا تھا

اور بیچارہ جمیل!! اس کی ہر ممکن سعی بھی تو انور کو
بیرسٹر نہ بنا سکی۔ اک کلرک کا قلیل مشاہرہ تو روزانہ ضروریات
ہی نہیں پوری کر سکتا چہ جائے کہ تعلیم کا بڑھتا ہوا بار جسے خواہش
ہونے پر بھی وہ کسی صورت میں نہیں اٹھا سکتا تھا۔ اس سے پہلے

اگر سلمیٰ ملازمت کا لفظ بھی منہ سے نکالتی تو جمیل بگڑ کر ملامت آمیز
لہجے میں کہتا "اونہہ! ملازمت کا تو نام ہی نہ لو سلمیٰ۔ اس روکھی
پھیکی ملازمت میں رکھا ہی کیا ہے؟ میرا فرزند تو آزاد
پیشہ اختیار کرے گا"

اور پھر وہ اپنا صبح صادق کا دیکھا ہوا خواب دُہرانے
لگتا جس میں عدالت کا منظر پیش نظر ہوتا جہاں لائق و قابل
بیرسٹر انور اپنی جرح سے ہزاروں کا خراج تحسین حاصل کرتا
پر اب! آہ چھبیس سال کے بعد اب اس تلخ حقیقت کا
احساس ہوا کہ سنہرے خوابوں کو بکھرتے تو دیر نہیں لگتی لیکن
ان کی تعبیر کی آرزو۔ الہٰذا وہ تو حقیقت سے کوسوں دور رہتی
ہے اور یہ ویرانۂ دل کو آباد کرنے والی حسرتیں۔ انکی ہستی ان
حد سے زیادہ کھلے ہوئے پھولوں سے بڑھ کر نہیں ہوتی جو لمحہ
بہ لمحہ فضاؤں میں منتشر ہوتے رہتے ہیں

حساس و غیور انور ہر طرح قابل ہونے پر بھی
کامرانی سے دور ہی رہا اور بمشکل تمام گریجویٹ ہونے پر بھی کلرکی
سے آگے نہ بڑھ سکا جس میں وہ کام کرتے کرتے تھک کر چور
ہو جاتا۔ صفحوں پر صفحے سیاہ کرتے کرتے اس کی انگلیاں شل

ہو کر رہ گئیں۔ اس پر بھی کام کا ہجوم تھا اور سینکڑوں غلطیوں کا اندیشہ! اس کے احساسات کی بڑھتی ہوئی کونپلوں کو ہر آنیوالا لمحہ جھکاتا ہی جاتا اور سینکڑوں تمنائیں اُبھر اُبھر کر دبتیں۔

صحت و توانائی کا مجسمہ انور اب پیکر افسردگی تھا اور تصویر یاس۔ اک بیس آلہ! جو ایک محدود دائرہ تک کام کرتا رہتا

سلمیٰ اب اُس کے سامنے اُن خوابوں کا ذکر تک کرنے سے گھبراتی جو کبھی اُس کی حیات کا اہم جزو رہ چکے تھے مستقبل کے خوشگوار نقشے پر انور کی گرتی ہوئی صحت حاوی ہو چکی تھی اور جمیل اُداس اُداس نگاہوں سے اپنے فرزند کی حالت کا مشاہدہ کرتا اور دل ہی دل میں گھٹ گھٹ کر رہ جاتا

اور آج پھر ویسی ہی اُداس سہ پہر تھی اور خزاں مسلط بر کائنات! آفتاب کی سنہری کرنیں کانپتی ہوئی کمرے میں داخل ہو رہی تھیں جہاں بستر پر لیٹا ہوا انور دنیا سے تخیل میں کھویا ہوا تھا اس کی نگاہیں دریچے سے باہر اُفق پر کسی چیز کو تلاش کر رہی تھیں جیسے کھوئی ہوئی طمانیت قلبی ڈھونڈ رہی ہوں۔ خشمناک آنکھیں بغیر کسی خاص طور پر جھپک رہی تھیں اور رخسار بنت النعش کے بادلوں کی طرح زرد زرد۔

دفعتاً باہر گلی میں کسی کے گانے کی آواز آئی ؎

اثر کچھ خواب کا نغموں میں باقی ہے تو اے بلبل
نوا را تلخ تر می زن ، چو ذوقِ نغمہ کم یابی

انور کو ایسا معلوم ہوا جیسے پہلو میں کچھ دیر کے لئے دل کی دھڑکن بند ہو گئی ہو۔

آہ! یہ اُن خوابوں کا ہی تو اثر تھا کہ آج تک اُس کے قلبِ حزیں کو راحت نصیب نہ ہو سکی۔ جامِ حیات کو جرعاتِ تلخ سے لبریز پاتے ہوئے بھی وہ اس میں شیرینی ڈھونڈتا رہا۔ اُس کی گہرائیوں میں جھانک جھانک کر مٹھاس تلاش کرتا رہا۔ اور نتیجہ۔ اُف! اُس انتھک سعی کا نتیجہ یہ نکلا کہ اس کی زندگی اک تشنۂ آب کنوئیں کی طرح ہو کر رہ گئی۔ تاریک اور اُداس اُداس جہاں آخری شعاعِ اُمید بھی پہنچنا پسند نہ کرتی ہو......

اور وہ سہانا مستقبل! وہ اب بھی دور تھا۔ بہت دور نہ معلوم کون سی غیر مرئی وادیوں میں نہاں۔

سلمیٰ اُس کے سرہانے بیٹھی اُس کی سلامتی کی دُعا مانگ رہی تھی اور جمیل پُرغم نگاہوں سے وہ سین

دیکھ رہا تھا جب ننھے انور کا جھولا جھلاتے" وقت وہ
منتشر کہ خواب دیکھا کرتے تھے، سہانے سہانے اور لطیف
خواب لیکن اُن کی تعبیر! اُن کی حقیقت!! آہ!!!

تلاشِ مطلوب

(۱)

دانی کہ چیست مصلحتِ ما گریستن
تنہا ملول بودن و تنہا گریستن
بیدردرا بہ صحبتِ اربابِ دل چہ کار
خندیدن آشنا نبود با گریستن

وہ صباح شملہ! شب بھر کی ہلکی ہلکی بارش کے بعد کُہر میں لپٹی ہوئی کائنات ایسی معلوم ہوتی تھی جیسے کسی عروسِ نو کے ضیائے حُسن کی جھلک پھیل رہی ہو سفیدے اور دیودار کے شاندار درخت دُھلے دُھلائے کھڑے تھے اور ہوا شربیلی سرسراہٹ سے پتّوں میں چُھپی چُھپی چل رہی تھی۔

ایسا خواب سے زیادہ جمیل اور تبسّم سے بڑھ کر حسین منظر اک طلسمی کشش رکھتا ہے۔ چنانچہ نہ معلوم کب تک اس عالم رنگ و بو کا اک عالم تحیّر میں مشاہدہ کرتی رہی کہ شعلہ کی ہنسی بھری آواز نے دفعتاً چونکا دیا۔ اس لڑکی کو ہمیشہ سے

میرے استغراق سے دلی کدورت رہی سہی پیچھے مڑ کر دیکھا تو
وہ مع اپنی جملہ شرارتوں کے موجود تھیں اور بیشتر اس کے کہ
اس دخل در معقولات پر متنبہ کر سکتی۔ انھوں نے کچھ ایسے پیرائے
میں گفتگو شروع کی اور سامنے والی پہاڑی پر چلنے کے لئے کہا
کہ میں تعمیل حکم کئے بغیر نہ رہ سکی اور دو شاطر ہی لمحہ میں سب گزشتہ
جھگڑوں کو بھول کر جو عام طور پر شملہ کی شرارتوں کی بنا پر
کھڑے ہوا کرتے تھے ہم ساتھ ساتھ قدم اُٹھاتے نشیبی
راستے طے کر رہے تھے۔

کچھ آگے اور ! اور شملہ کی مشہور و معروف سڑک
مال روڈ سامنے موجود تھی مع اپنی رعنائیوں اور سرفرازی کے
جہاں حاکم و محکوم کا تفاوت خود ہی اپنی تفسیر بن کر آگے اکھڑ
ہوتا ہے اور ہر مغرب زدہ ہندوستانی نوجوان کو اس بات کا اندازہ
ہو جاتا ہے کہ ہر شعبۂ حیات میں مغرب مغرب ہے اور مشرق مشرق
سامنے ہی لوگوں کا جمّ غفیر دیکھ کر شملہ تفتیش حال کے
لئے گئیں اور کچھ دیر کے بعد یہ خبر لائیں کہ اک ضعیف سی خاتون
کسی کشا کے نیچے آ کر کچل گئی ہیں۔ بارش کا موسم اُس پر سخت چوٹ
اور سب سے بڑھ کر ضعیف العمری۔ ہمیں یہی مناسب معلوم ہوا کہ

جس قدر جلد ممکن ہو انھیں اپنے ہمراہ لے جا کر فوری توجہ کی جائے

خاتون مذکور اگرچہ خزاں دیدہ معلوم ہوتی تھیں
لیکن بہارِ حیات کے ہلکے ہلکے نقوش اب بھی کہیں کہیں موجود
تھے۔ اُن کے چہرے سے شرافت ہویدا تھی اور بُردباری نمایاں

اس بات کو ایک ہفتہ گزر گیا۔ اس عرصے میں وہ
پوری طرح رو بصحت تو نہ ہو سکیں پھر بھی اس لائق ہو گئی تھیں
کہ بغیر کسی تکلیف کے اُٹھ کر بیٹھ سکیں۔ پہلے روز ہمیں اپنے
قریب دیکھ کر اُنھیں سخت حیرانی ہوئی تھی لیکن حالات کا
اندازہ لگا کر فوراً معاملہ کی تہہ کو پہنچ گئیں اور اُن کا اظہارِ تشکر
آنسو تھے جو نہایت فراخدلی سے بات بات پر ان کا تکیہ بھگو دیتے

مجھے خاتون موصوف سے قلبی ہمدردی اور ایک قسم
کا اُنس سا ہو گیا تھا۔ حیرت تھی کہ یہ کون ہیں اور ان خاتون
کو کیوں کر پہنچیں جب کہ خاندانی نجابت تو ان کی ہر حرکت
سے ہویدا ہے۔ شعلہ کا بھی یہی حال تھا گویا کہ اپنی تمام شرارتوں
کو کچھ عرصہ کے لئے بھول کر اس معمہ کو حل کرنا چاہتی تھیں۔

زبیدہ خانم (خاتون موصوفہ کا نام) ہماری اس
بے چینی سے واقف تھیں جس نے ہم دونوں کو پریشان کر دیا تھا

چنانچہ ایک روز قدرے افاقہ ہونے پر یوں گویا ہوئیں۔

"میں جانتی ہوں جو خلش تمھیں بے قرار کر رہی ہے میں اپنے حالات بھی سناؤں گی اور ضرور ا ضرور!! کیونکہ اب تک تو اس بات کا گلہ ہی رہا ہے

دل سوز کوئی ہو تو سُنے دل کا ماجرا

کس کو سنائیں حال غمِ جانگداز کا

لیکن اب جب کہ دو شریکِ حال مل گئے ہیں اس داستان کا سُنا دینا ہی زیادہ بہتر معلوم ہوتا ہے"

"زہے نصیب!" میں نے شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا

"خوشا قسمت!" شعلہ نے بھی اظہارِ اطمینان و تشکر کیا

"میری عزیز بچیو!" زبیدہ خانم آغازِ داستان کرتے ہوئے بولیں "جس حال میں آج تم مجھے دیکھ رہی ہو یہ واقعی تمھارے لئے باعثِ استعجاب ہوگا۔ شملہ جیسے شہر میں یوں مارے مارے پھرنا اور وہ بھی اکیلے۔ نہ کوئی پُرسانِ حال اور نہ کوئی پُرسش کرنے کا خواہشمند! لیکن اگر یہ کہوں کہ اب سے پندرہ سال پیشتر کسی کو خواب میں بھی اس بات کا خیال نہیں آسکتا تھا تو بے جا نہ ہوگا۔ بمشکل تمام اپنے اوپر قابو پاتے ہوئے

پر آہ! وہ گردش تقدیر ہی کیا جو ایام مسرت کو اک افسانۂ پارینہ نہ بنا دے مجھ بدنصیب کو اک فارغ البال خانداں کی اکلوتی لڑکی ہونے کا شرف حاصل ہے جس کا بچپن ایسے ناز و نعم میں بسر ہوا کہ بہت کم لوگوں کو نصیب ہوا ہوگا اس کے بعد ازدواج کا وہ مسرور ترین زمانہ! جس کے پانچ سال پلک جھپکانے گزر گئے۔ ہر طرف طمانیت قلبی کا دور دورہ تھا اور بڑھتی ہوئی شادمانیوں کا حصار۔

اور پھر وہ صبح! آہ اس روز صباح برشگال نے مجھے اسی کے تصور میں تو غرق کر دیا تھا جب دلکشا والا حادثہ رونما ہوا۔ ہاں وہ ایسی ہی سہانی اور کیف آفریں صبح تھی۔ عاشر میرے شوہر آرام کرسی پر لیٹے ہوئے کوئی کتاب دیکھ رہے تھے اور میں ان کے قریب ہی بیٹھی سلائی میں مصروف تھی گزشتہ کئی روز سے میں دیکھ رہی تھی کہ وہ کچھ کھوئے کھوئے سے رہتے ہیں اور کوئی ایسا راز سربستہ ہے جسے آشکارا تو کرنا چاہتے ہیں لیکن شاید کچھ ہچکچاہٹ سی معلوم ہوتی ہے۔ میں ان کے خیالات کی تہہ تک پہنچنے کی غرض سے غور سے ان کا چہرہ تک رہی تھی کہ میری ادھیڑ بن کا اندازہ لگا کر جیسے کہ وہ چونک اٹھے

اور مسکرا کر کہنے لگے "بیگم! اگر تم بُرا نہ مانو تو ایک بات کہوں"

"ضرور!" میں ہمہ تن گوش ہو کر بولی "آخر وہ کون سی ایسی بات ہے جس سے تمھیں خیال ہوا کہ میں بُرا مان جاؤنگی"

"تو لو سنو!" وہ قدرے رُک رُک کر بولے "میں کم از کم تین سال کے لئے ولایت جانا چاہتا ہوں تاکہ وہاں سے کوئی اعلیٰ ڈگری حاصل کر کے اپنے ہم چشموں میں درجۂ امتیاز حاصل کرسکوں۔ اس کے لئے کم و بیش پندرہ ہزار روپے کی ضرورت ہے اور میرے پاس اس قدر اثاثہ نہیں اگر تم میری کچھ مدد کرسکو تو ......"

"بس اتنی ہی بات تھی!" میں قطع کلام کرتے ہوئے بولی "جس کیلئے اس قدر لیت و لعل کر رہے تھے۔ ابا جان کا دیا ہوا روپیہ آخر میرے کس کام آئے گا۔ تم بڑے شوق سے لے جاؤ اور خاطر خواہ کامیابی حاصل کرو کیونکہ میری خوشی تو تمھاری ہی مسرت میں مضمر ہے"

"سچے دل سے کہہ رہی ہو زبیدہ!"

"اور نہیں تو کیا جھوٹے دل سے" اور میں نے تجوری کی چابی اُن کے ہاتھ میں پکڑا دی لیکن یہ میری نادانی

تھی! سخت نادانی!! جس کا خمیازہ آج تک بھگت رہی ہوں اور شاید دمِ واپسیں تک بھگتنا پڑے"

عارف خوش و خرم ولایت سدھارے۔ جاتے وقت تک میری دلجوئی کرتے رہے اور مقصد حاصل ہوتے ہی فوراً واپس آجانے کا وعدہ کیا۔ بہرحال میں اپنے والدین کے پاس آگئی اور اُن کی واپسی کے دن ایک ایک کر کے گننے لگی

پہلے چھ ماہ تک تو عارف کے شوق سے لبریز خطوط باقاعدہ موصول ہوتے رہے لیکن اس کے بعد انھوں نے خاموشی اختیار کر لی مسلسل و معنی خیز خاموشی۔

ابا مجھ سے سخت ناراض تھے کہ اُن سے بغیر کہے سُنے روپیہ کیوں دیا گیا اور امی مجھے افسردہ دیکھ کر خود بھی دلگیر تھیں لیکن افسوس کہ جس ہستی سے میری تمام اُمیدیں وابستہ تھیں وہ بے پروا تھی اور تمام حالات سے بے خبر۔

میرے تمام خطوط اور یاد دہانیوں کا معبود ہی جانتا ہے کہ کیا اثر ہوا آخر تن بہ تقدیر کہہ کر خاموش ہو گئی کہ کبھی تو اُنھیں میرے حالِ زار پر رحم آئے گا۔

خدا خدا کر کے تین سال گزرے اور عارف کے

ایک چند حرفی خط سے معلوم ہوا کہ وہ کامیاب ہو کر واپس لوٹ رہے ہیں یا تو اتنا عرصہ کوئی خط ہی نہ لکھا اور اب اگر لکھا بھی تو گویا جبریہ! وہ پہلی سی گرمجوشی و الفت ندارد تھی۔

بہرحال وہ دن بھی آیا جس کا مجھے اس شدّومد سے انتظار تھا۔ عارف وطن آرہے تھے اور بیرسٹر ہو کر۔ ان کی بے وفائی کے باوجود کائنات کا ذرّہ ذرّہ مجھے مسکراتا نظر آتا اور فضائیں جیسے غیر مرئی روحیں قہقہے لگا لگا کر میرے شاملِ حال ہو رہی ہوں۔

جہاز کے آنے سے کافی دیر پہلے میں سراپا انتظار بنی کھڑی تھی۔ نگاہیں پانی کی اٹکھیلیاں کرتی ہوئی موجوں پر تیر رہی تھیں جو میرے محبوب کو بہت جلد میرے قریب سے قریب تر پہنچانے والی تھیں۔

آخرکار وہ وقت بھی آگیا جب جہاز ساحل پر لنگر انداز ہوا۔ میں نے دھڑکتے ہوئے دل سے عرشہ کی جانب نگاہ ڈالی۔ فرطِ مسرت سے آنکھوں میں آنسو بھی ڈبڈبا آئے تھے۔ عارف، میری امیدوں کے ملجا و ماوی وہاں کھڑے تھے لیکن اس حال میں کہ ایک یوروپین خاتون کا ہاتھ

تھامے ہوئے اور مسکرا مسکرا کر اُس سے باتیں بھی کرتے جاتے تھے۔ مجھ پر نظر پڑی تو بے طرح گھبرا اُٹھے اور کچھ اس طرح انجان بن گئے جیسے کبھی دیکھا ہی نہیں تھا۔ آہ! میں اس سے زیادہ برداشت نہ کر سکی۔ نہ تاب دیدن تھی اور نہ یارائے شنیدن! میری آرزوؤں کا قلعہ مسمار ہو کر ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا تھا اور آبی پرندے اک دردناک آواز میں میرے ہمنوا ہو کر چلّا رہے تھے۔

میرے سُنہرے خوابوں کی یہ تعبیر! کچھ دیر تک تو مجھے یقین ہی نہ آیا لیکن یہ حقیقت تھی اُلجھن کی طرح کھا جانیوالی حقیقت میں عارف سے دوچار ہونے سے پیشتر ہی اپنے شہر کو چلی آئی اور حیات کی اس تلخی کو بھولنے کی ہر ممکن کوشش کرنے لگی لیکن بے سود! ایک خفیہ غم اندر ہی اندر دل و دماغ پر چھا رہا تھا اور بے معنی زندگی کا ایک ایک لمحہ وبالِ جان تھا

لیکن خدا بھلا کرے بیادرِ عارف کا جنھوں نے کسی مصلحت کی بنا پر ایک شہر میں قربت کو بھی مناسب نہ سمجھا شاید یورپین خاتون سے میری ہستی پوشیدہ رکھی گئی ہو اور اپنی اس نئی شریکِ حیات کو لے کر مجھ سے ملے بغیر شملہ چلے آئے۔

دان سالوں میں تبدیل ہوتے رہتے میرے آلام روحانی ترقی پذیر تھے اور یورپین خاتون کی آسائشوں میں اضافہ ہو رہا تھا لیکن اس کے باوجود اُڑتی ہوئی خبریں پہنچتی رہتیں کہ وہ خوش نہیں ہیں۔ آمدنی بڑھانے کا ہر ممکن طریقہ عارف اختیار کرتے لیکن ہر سعی بسیار اُن کی بیگم کے بڑھتے ہوئے مصارف پورا کرنے میں ناکافی ثابت ہوتی۔ وہ پریشان تھے اور اُن کی پریشانی کے تصور سے میں سیکڑوں میل دور بیٹھی ہوئی گریاں۔ آہ! خاتونِ ہند!! قدرت نے تجھے کیسا عجوبۂ روزگار دل عطا کیا ہے۔

اِدھر گزشتہ چند ماہ سے عارف کی خانگی ناچاقی بڑھ رہی تھی مجھے خفیہ طور پر معلوم ہوا کہ بیگم عارف چند جواہرات خریدنا چاہتی ہیں جن کی مجموعی قیمت کم از کم بیس ہزار روپے ہے اگر یہ جواہرات نہ خرید سکے تو ممکن ہے کہ ہمیشہ کے لئے قطع تعلق ہو جائے۔ حد سے بڑھ کر اسراف نے انھیں تو اس لائق رکھا ہی نہیں تھا کہ کچھ جمع کر سکیں۔

ناموس شوہر پہ قربان ہو جانا ہندوستانی خاتون کے لئے معمولی بات رہی ہے۔ ہر قسم کے مصائب کو وہ خندہ

پشیمانی کے ساتھ برداشت کرتی ہے اور وقت آنے پر سہ

محفل میں ان کی آہ کا شعلہ عیاں نہ ہو

جل بجھئے اس طرح سے کہ مطلق دھواں نہ ہو

کہتے ہوئے جان اجان آفریں کے حوالہ کرنے میں بھی تامل نہیں کرتی

آہ! میں بھی اب صبر نہ کر سکی۔ میرے عارف اور ان چکروں میں گرفتار۔ میرے لئے ہر آنے والی صبح صباح ملال ہوتی اور ہر شام شام غم۔

آخر میں نے یہ مکان فروخت کر دیا یہ قبلہ والد صاحب کی آخری نشانی رہ گئی تھی جسے عارف پر نچھاور کرنے میں مجھے کچھ پس و پیش نہ ہوا اور روپیہ اُنھیں پہنچا دیا تاکہ بیگم صاحبہ کی فرمائش پوری کر سکیں۔ عارف جانتے تھے کہ اس روپے کا بھیجنے والا کون ہے اور جن دشواریوں سے اُن تک پہنچایا گیا۔ وہ اُن سے بھی ناواقف نہ تھے لیکن کچھ ایسے اس خاتون کی دلجوئی میں مصروف تھے کہ جھوٹ موٹ بھی میری حالت دریافت نہ کرا سکے۔

اگر اب بھی بس ہو جاتا تو کافی سے زیادہ تھا لیکن یہ نا ممکنات سے تھا کہ اس بُری طرح لوٹ لینے کے بعد اب

عارف کے پاس رہنا بھی گوارا کیا جاتا جن کی نہ صرف پریکٹس بند ہو چکی تھی بلکہ بنت نئی ضروریات پوری کرنے کے قابل بھی نہ تھے اور پریکٹس چلتی بھی کیونکر جب کہ ہر وقت تو انھیں کسی نئے انتشار اور دماغی الجھن میں مبتلا رکھا جاتا۔

آہ! اس دختر مغرب نے اپنی پرانی روایات زندہ رکھنے کے لئے وہی کیا جس کی کہ اس سے امید کی جاسکتی تھی حر

اِدھر کئی روز سے افواہ مشہور تھی کہ اس کا میل جول ریٹائرڈ پولیس آفیسر سے بڑھتا جا رہا ہے۔ عارف کی جرأت ہی کیا تھی کہ ایک لفظ بھی بول سکتے وہ خاموش تھے اور دم بخود۔

کوئی مشرقی خاتون تھوڑی تھیں کہ اپنے خدائے مجازی کے محض اشارے پر سرِ تسلیم خم کر دیتی۔ انھیں کچھ کہنا تو گویا بیٹھے بٹھلائے مصیبت مول لینا تھا اور اب تہیاست عارف کے پاس رکھا ہی کیا تھا جو انھیں اپنی طرف مائل رکھتا۔ ادھر یہ بھی بے بس تھی کہ کچھ مدد دے سکتی۔ کہیں سر چھپا کر بیٹھنے تک کے تو لالے پڑے ہوئے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ایک شب وہ مسٹر جیمس کے ہاں جو گئیں تو واپس لوٹ کر ہی نہ آئیں۔ عارف کیس بر سنے پر خوشامد کرنے جانے۔ دوسرے روز معلوم ہوا

کہ وہ تو عازم انگلستان بھی ہو چکیں

ہندوستان کی زہریلی سے زہریلی ناگن میں بھی وہ بس نہیں ہوتا جو بنت المغرب اپنی نیلگوں آنکھوں کی گہرائیوں میں پوشیدہ کئے ہوئے ہے۔ عارف سب کچھ گوارا کر سکتے تھے لیکن یہ بے عزتی اُن کی برداشت سے باہر تھی وہ دیوانے سے ہو گئے چنانچہ جب تک میں اُن کے پاس پہنچ سکتی۔ وہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر روپوش ہو چکے تھے۔

وہ دن اور آج کا دن! اس بات کو پندرہ برس ہونے کو آئے۔ خزاں کی جگہ گلپوش بہار لے لیتی ہے ہر سال نئے نئے انقلابات آ رہے ہیں اور نئے نئے حوادث سے دوچار ہونا پڑتا ہے لیکن میں اپنی ان تھک سعی میں محو ہوں اور وہ ہے "تلاشِ عارف"۔

گلشنِ حیات پر خزاں غلبہ پا چکی۔ موت بھی نزدیک سے نزدیک تر آ رہی ہے لیکن میری جستجو کی مہم جاری ہے اور دمِ واپسیں تک جاری رہے گی۔ عارف اکثر یہاں شملہ رہنے کے عادی تھے۔ میں ہر سال سینکڑوں مصائب برداشت کر کے یہاں آتی ہوں کہ شاید اب بھی اُنھیں مجھ پر ترس

آجائے اور کبھی اسی طرف آنکلیں۔ دنیا انھیں چھوڑ دے تو چھوڑ دے لیکن ان کی زبیدہ تو ان کا ساتھ کبھی نہ چھوڑے گی میں انھیں ڈھونڈ نکالوں گی اور ضرور! ضرور!!

خاتون زبیدہ یہاں پہنچ کر خاموش ہو گئیں کوئی مبہم سی خلش اُن کے دل و دماغ پر حاوی تھی۔ باہر درختوں کے سائے لمبے ہوتے جاتے۔ اور کئی پرندے ایک ساتھ مل کر چلا رہے تھے جیسے اُن کے حالِ زار پر محوِ فغاں ہوں

میں اور شعلہ یہ ہوشربا داستان سن کر اک عالم سکتہ میں رہ گئیں اور کچھ ایسی حیرت زدہ! کہ کچھ دیر کیلئے طاقتِ گویائی ہی نہ رہی۔ آخر اس محویت کو شعلہ نے توڑا اور زبیدہ خانم سے کہنے لگیں۔

"خاتون! جو ہونا تھا وہ ہو چکا۔ اب زندگی کی گزشتہ تلخیوں کو بھول جائیے۔ آپ کے فی ہر دو گرم چشیدہ زمانہ میں کہاں تک مصائب کا بار اٹھاتی رہیں گی"

"تم اس کا اندازہ نہیں لگا سکتیں بچی! تم ابھی کمسن ہو۔ ورنہ حقیقتِ مزِ حیات تو یہی ہے کہ تلاشِ مطلوب میں اپنی ہستی تک کو فنا کر دیا جائے"

"تو پھر اب آپ کا کیا ارادہ ہے؟" میں نے گفتگو میں حصّہ لیتے ہوئے کہا۔

"ارادہ!" زبیدہ خانم آہ سرد بھر کر بولیں۔ "یہی کہ اپنے مطلوب کو پالوں یا اُن کے نقشِ پا پر اپنے آپ کو فنا کر دوں، برباد کر دوں اور کھو کر رہ جاؤں"

"آفریں دخترِ ہند!" شعلہ نے زیرِ لب کہا اور میں عقیدتمندانہ نگاہوں سے سالخوردہ زبیدہ خانم کو دیکھ رہی تھی۔ جنھیں ضعیف بنانے میں زمانے کے دَور اور گردشِ تقدیر نے بھی کچھ کم حصّہ نہیں لیا تھا

دوسری صبح جب ہم سلام کرنے کے لئے زبیدہ خانم کے کمرے میں گئے تو بستر خالی تھا۔ ہر چہار طرف ڈھونڈا لیکن بے کار! قیاس غالب ہے کہ وہ اپنی تلاش میں کہیں اور روانہ ہو گئی ہونگی۔

اب بھی صباح برشگال کو کسی ضعیف العمر خاتون کو اِدھر اُدھر بھٹکتے دیکھتی ہوں تو زبیدہ خانم کی تصویر نگاہوں کے سامنے آ کھڑی ہوتی ہے

معبود! کیا انھیں اپنی تلاش میں کامیابی ہوئی؟

ہو گی۔ ان کی وہ آخری خواہش۔ مطلوب تک پہنچنے کی تمنا جس کے سہارے ان کی محدود دنیا قائم ہے کبھی پوری بھی ہو گی یا یہ خواب شرمندۂ تعبیر ہی رہے گا اور عارف! بیرحم و ظالم عارف!! کیا وہ بھی اپنی ٹھکرائی ہوئی الم رسیدہ ہستی کے حضور میں حاضر ہو کر اپنے گناہوں کا کفارہ ادا کر دے گا۔

کسی نے سچ کہا ہے کہ

چوں زن ہندی کسے در عاشقی مردانہ نیست

صفیہ

باورچی خانے کی فضا دھواں دھار تھی اور ماحول
افسردہ کن۔ تمام چیزیں بے ترتیبی سے اُدھر اُدھر بکھری پڑی
تھیں جیسے ان کی ترتیب سے کسی کو وابستگی نہ ہو یہاں تک
کہ تفکرات میں غلطاں و پیچاں صفیہ کو اب تک محسوس ہی نہ ہو
سکا کہ سالن قریب قریب جل چکا ہے اور انگیٹھی میں آنچ بھی
حد سے زیادہ ہے اُس کی آنکھیں نمناک تھیں اور چہرہ غیر
معمولی طور پر المناک کہ اچانک اک ناخوشگوار سی بو نے
اُسے اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ چونک کر دیکھا تو ساکت ہو کر
رہ گئی اور ابھی پوری طرح اپنی کوتاہی کا ماتم بھی نہ کر چکی
تھی کہ اُس کی ساس غصّہ سے چیختی چلاتی کمرے میں داخل
ہوئی اور صفیہ کا ننھا سا قلب دھک سے رہ گیا۔

بڑی بی چلا رہی تھیں اور برس رہی تھیں "بدنصیب!
آج پھر سالن برباد کر دیا۔ کوئی ڈھنگ بھی سیکھا تھا ماں باپ نے
یا یوں ہی میرا جی جلانے کے لئے یہاں آ بیٹھی تھی۔ ایسی ہی تو اب

کی بھی تھی تو میکے سے پوچھا کیوں نہ ساتھ لائی" وغیرہ وغیرہ
صفیہ آنسوؤں کو بڑی سختی سے ضبط کر رہی تھی۔ وہ بار بار بہنے کے لئے مچل پڑتے لیکن پلکوں میں تھرتھرا کر رہ جاتے
یہ پہلا موقع نہیں تھا کہ اُسے ایسے سخت سُست الفاظ سننے پڑے
اور وہ بھی اک معمولی سی بات پر۔ گزشتہ دو سال سے ایسی
باتیں سُن سُن کر وہ ان کی عادی ہو چکی تھی لیکن آج صبح کے
واقعے نے تو اُسے حد سے بڑھ کر ایذا پہنچائی۔ بات صرف
اتنی تھی کہ بڑی بی پاندان میں چوڑی رکھ کر بھول گئیں اور جب
وقت پر اُسے ڈھونڈ نہ سکیں تو چلا چلا کر گھر آسمان پر اٹھا لیا
کہ آج چوڑی غائب ہوئی ہے۔ کل نہ معلوم کس چیز کی باری
آئے گی۔ نہ معلوم کبھی پیسے بھی دیکھے تھے یا نہیں" ظاہر ہے
کہ اشارہ صریحاً صفیہ کی طرف تھا اور یہ چیخ پکار اس وقت
تک جاری رہی جب تک وہ چیخ چیخ کر تھک نہ گئیں اور
پاندان میں سے پیسے نہ دستیاب ہو گئے۔
آج پہلا دن تھا کہ صفیہ کو چور بھی بنایا گیا تھا
یہ ایسا واقعہ نہ تھا کہ وہ اسے آسانی سے بھول سکتی چنانچہ
یہی وجہ تھی کہ اُس کے مغموم چہرے پر غم کے سائے کوند رہے

تھے اور روح افسردگی کی گہرائیوں میں ڈوبی ڈوبی یہاں
تک کہ سانس کے چلنے کی بھی خبر نہ ہوسکی۔

شام کو یہ واقعہ گہری حاشیہ آرائیوں سے سجاد
صاحب کے آگے دہرا دیا گیا۔ وہ ایک صلح کل اور نیک طینت انسان
تھے اور بے زبان بہو کی مجبوریوں سے واقف اور اس کی خوبیوں
کے قائل۔ انھوں نے سرسری انداز سے بات ٹالنی چاہی تو بڑی
بی ان سے بھی بگڑ بیٹھیں کہ "تمھاری ہر وقت کی شہ نے ہی تو
اسے ساتویں آسمان پر چڑھا دیا ہے۔ اس طرفداری نے ہی تو
بیٹے اور بہو دونوں کو کھو کر رکھ دیا۔ اس کا بھی علی گڑھ سے
گھر بھی خط آتا ہے تو سیدھا بیوی کے نام۔ ہم جو ہر ماہ اتنی رقم
روانہ کرتے رہتے ہیں اس کی کوئی پرواہ ہی نہیں"

تنگ آ کر سجاد صاحب چلے گئے لیکن بڑی بی ایسی
آسانی سے شکست ماننے والی نہیں تھیں۔ انھیں اس وقت
تک چین نہ لینے دیا جب تک یہ نہ منوا لیا کہ صفیہ کو صبح ہی
اس کے ماں باپ کے گھر روانہ کر دیا جائے گا۔ جاوید کی غیر موجودگی
میں اس کی یہاں ضرورت ہی کیا ہے جب کہ اسے کسی کام
کاج ڈھنگ سے بھی نہیں آتا"

سجاد صاحب نے بھی سوچا کہ گھر کی فضا روز بروز بگڑ ر

ہوتی جاتی ہے جس کا اثر صفیہ کی صحت پر بھی برابر پڑ رہا ہے ایسی حالت میں اس کا ماں باپ کے ہاں چلا جانا ہی زیادہ بہتر رہے گا چنانچہ صفیہ سے دریافت کیا تو وہ بھی جانے کے لئے رضامند ہو گئی کہ کم سے کم ہر وقت کی کوفت سے تو نجات مل جائے گی۔ تاہم بڑی بی کے تیور اب بھی بگڑے ہوئے تھے اور وہ بہو کی روانگی کے وقت بھی اسے خون کے آنسو رلائے بغیر نہ رہ سکیں۔

صفیہ گو اب میکہ جا چکی تھی جہاں کا ہر شخص اس کی آمد پر شاد و شاد تھا اور اس کی معمولی سی خواہش کے پورا کرنے کو دست بستہ لیکن پھر بھی وہ ملول تھی اور ہر لمحہ افسردہ۔ وہ ایک غیور اور حساس لڑکی تھی۔ ساس کے چلتے وقت کے سلوک نے اس کے لئے تیر و نشتر کا کام کیا تھا اور اس کی ناراضگی کا احساس کانٹا بن کر اس کے قلب میں چبھ رہا تھا۔ ورنہ وہ تو ہمہ تن صفت موصوف تھی۔ بیحد خوش اخلاق اور کم گو حالانکہ بڑی بی کے تعلقات اس کے ساتھ ناگفتہ بہ ہی رہے لیکن اس نے کبھی الٹ کر جواب دینے کی بھی جرأت نہ کی اور نہ ہی یہ بات اسے پسند تھی۔

جاوید چونکہ ابھی یونیورسٹی کا طالبعلم تھا اور زیادہ تر باہر ہی رہتا اس لئے گھر کے ناخوشگوار حالات کا اسے کبھی علم نہ ہو سکا

ماں کی تلخ طبیعت سے تو وہ واقف ہی تھا لیکن صفیہ کبھی حرفِ شکایت زبان پر نہیں لائی تھی۔

اسے ماں باپ کے ہاں آئے اب دو ماہ ہو چکے تھے لیکن بڑی بی اب تک نہیں پسیجی تھیں۔ اس لئے سجاد صاحب بھی اس کی واپسی کا تذکرہ نہ کر سکے۔ خیال غالب تھا کہ سرمائی تعطیلات میں جاوید کے آنے پر تو ویسے بھی اُسے بلانا ہی ہے۔ ابھی سے ناحق بڑی بی کے تلخ کلمات سننے کے لئے کیوں بلایا جائے۔ صفیہ بھی بظاہر اس گھر میں جانے کے لئے تیار نہیں تھی جہاں اس کی کچھ حیثیت تھی اور نہ وقعت۔

لیکن اچانک اک آمدہ تار نے اس کے خیالات متزلزل کر دئیے۔ تار سجاد صاحب کی تھی کہ بڑی بی یکایک نمونیہ کا شکار ہو گئی ہیں۔ گھر پر خبر لینے والا کوئی نہیں ہے اس لئے جلد از جلد پہنچنے کی کوشش کی جائے۔

صفیہ کی بجائے کوئی اور لڑکی ہوتی تو ضرور جانے سے انکار کر دیتی لیکن اس کی تو سرشت ہی ایسی نہ تھی جانتی تھی کہ اگر ساس خواہ مخواہ بد خواہ بن گئی ہے تو ایسے نازک موقع پر اس کے کام آنے سے انکار کر دینا کہاں کی دانشمندی ہے چنانچہ وہ باوجود

اپنی والدہ کی تنبیہ کے واپس جانے کے لئے تیار ہو گئی

بڑی بی کی حالت کچھ اچھی نہیں تھی۔ ایک تو ضعیفی اور
پھر نمونیا۔ نقاہت اس قدر تھی کہ وہ کروٹ بھی نہیں لے سکتی تھیں
اور صفیہ سے نگاہیں دوچار کرتے بھی کتراتیں لیکن صد آفریں اس
لڑکی کو کہ گزشتہ کدورتوں کو بھول کر تیمارداری میں مصروف
ہو گئی اور ایسی تندہی سے خدمت کرنے لگی کہ ان کی اپنی لڑکی
ہوتی تو وہ بھی شاید اس قدر کام نہ آتی۔ وہ جانتی تھی کہ یہی موقع
اپنی فرمانبرداری کا سکہ بٹھانے کا ہے ویسے بھی اُس نے تو بڑی
بی کو آج تک ماں کے برابر سمجھا لیکن یہ رشتہ ہی ایسا تھا کہ انھیں
آج تک اس کا ہر ہنر عیب ہی نظر آتا رہا تاہم اب وہ صفیہ کی
جانفشانیوں سے متاثر ضرور تھیں اور اُس کی ہر سعی کو بہ نظر
استحسان دیکھتیں۔ وہ پشیمان تھیں کہ ایسی موہنی اور ہیرے جیسی
لڑکی کو وہ آج تک سمجھ ہی نہ سکیں۔ اپنے کئے پر وہ شرمندہ
تھیں اور بے حد نادم۔

نوبت بہ اینجا رسید کہ وہی بڑی بی جو کبھی صفیہ سے
بات کرنا بھی کسرِ شان خیال کرتی تھیں اب بستر پر پڑے پڑے
اس کا چہرہ تکتیں جیسے اُن کی بڑھتی ہوئی بیماری نے پژمردہ

کر دیا تھا اور ایک حد تک زرد زرد۔

بڑی بی کی حالت روز بروز خراب ہی ہوتی گئی اور اس حد تک کہ انجام کار جاوید کو بھی تار دے کر بلانا پڑا ڈاکٹر قریشی کی رائے تھی کہ صرف ایک مبہم سی امید رہ گئی ہے اور محض ایک ذریعہ اگر وہ کام میں لایا جائے تو شاید مریضہ کچھ عرصے کے لئے اور زندہ رہ جائے"

سب ہمہ تن گوش تھے اور سننے کے لئے خاموش کہ وہ کون سا ذریعہ ہو سکتا ہے۔

صفیہ بے چین ہو کر بولی "ڈاکٹر صاحب جلدی سے بتلائیے کہ وہ کون سا طریقہ ہے اور میں اس سلسلے میں کیا مدد دے سکتی ہوں"

"ان کے بدن میں طاقت پہنچانے کے لئے مجھے کسی قدر تازہ انسانی خون کی ضرورت ہے جو جسم کے لئے غذا کا کام دے سکے اور مردہ رگوں کو حرارت۔"

سب دم بخود تھے اور ساکت۔ کسی کو خیال بھی نہ آسکتا تھا کہ ڈاکٹر کی رائے اس قدر سخت ہو گی۔ انسانی خون ایک سالخوردہ ہستی کے لئے مہیا کرنا۔ معاذ اللہ۔ کس قدر غیر دانشمندانہ

فعل تھا۔ بڑی بی امید و بیم کی حالت میں ایک ایک کا چہرہ دیکھ رہی تھیں۔ ان کی نگاہوں میں یاس کی جھلک تھی اور زندگی کی طلب۔

ایکا ایکی صفیہ کی نازک سی کلائی آگے بڑھی وہ اپنا خون دینے کے لئے تیار ہو چکی تھی اس کی بڑی بڑی آنکھیں غیر معمولی طور پر چمک رہی تھیں اور ان سے کوئی عزم نہاں عیاں تھا

"آپ کے جسم میں تو یوں بھی خون کی قلت معلوم ہوتی ہے" ڈاکٹر قریشی اس کے ہاتھ کی طرف دیکھتے ہوئے بولے

"اس کا خیال نہ کیجئے ڈاکٹر صاحب" صفیہ نے لجاجت سے کہا "آپ کو ضرورت کے مطابق خون تو مل ہی جائے گا"

وفورِ ہیجان اور شدتِ جوش سے بڑی بی اٹھ کر بیٹھ گئیں اور ہاتھ کے اشارے سے تمام لوگوں کو کمرے سے باہر جانے کے لئے کہا۔ اس کے بعد تنہائی میں صفیہ کو سینے سے چمٹائے وہ آنسو بہاتی رہیں۔

"میری عزیز بچی! میں ابھی تک تمھیں نہ سمجھ سکی تھی" انجام کار وہ بے ساختہ ہو کر بولیں "لیکن تم نے آج میری آنکھیں کھول دی ہیں جس کے لئے میں بیحد ممنون ہوں اور حد سے زیادہ مشکور"

"میں نے آپ کے لئے کچھ نہیں کیا امی جان! یہ تو میرا فرض تھا جسے بہرحال ادا کرنا ہی ہے اور میں اس کے لئے دلی مسرت سے تیار ہوں"

"لیکن اب اس کی ضرورت ہی نہیں رہی۔ تم پہلے ہی کیا میرے لئے کچھ کم کر چکی ہو کہ اب اس کی بھی کسر باقی رہ گئی تھی ایسی نیک سیرت بہو پر تو مجھے خود فدا ہو جانا چاہیے تھا نہ کہ اسے تکلیف میں ڈال کر خود فائدہ اٹھاؤں"

صفیہ نے بہت کوشش کی کہ بڑی بی کسی طرح اس امر پر راضی ہو جائیں لیکن بے سود۔ ان کا ہر جواب نفی میں تھا۔ زیادہ اصرار پر صرف یہی کہا کہ "میرے تو مرنے کے دن آ ہی گئے ہیں تمہاری جان کو ہلاکت میں کیوں ڈالوں"

دوسرے دن بڑی بی کی حالت اور بھی خراب ہو چکی تھی لیکن چہرہ بشاش تھا اور صفیہ سے صلح ہو جانے کی وجہ سے قدرے شگفتہ۔ تاہم وہ موت کو خوش آمدید کہنے کے لئے راضی برضا تھیں اور بہو کو اپنی جانشین چھوڑ جانے پر بے حد نازاں۔ آخر وہ شب بھی آ ہی گئی جس کا تصور بھی صفیہ کو لرزہ براندام کر رہا تھا فضا پر افسردگی چھا رہی تھی۔ درختوں کے پتوں کی سرسراہٹ

سے ایسا معلوم ہوتا جیسے وہ موت کے راگ گا رہے ہوں اور
کائنات اک وسیع قبرستان نظر آتی۔

تمام عزیز و اقربا جمع تھے لیکن بڑی بی سب سے بے نیاز
محض صفیہ سے سروکار رکھے ہوئے تھیں یہاں تک کہ دم واپسیں
الفاظ بھی وہی تھے جو اشک آلود نگاہوں سے اُسے دیکھتے ہوئے
کپکپاتے ہونٹوں سے ادا ہوئے کہ "معبود! اسے ہمیشہ شاد و مسرور
رکھے اور آفات و ہم سے دور"

اس کے جواب میں صفیہ سسکیاں لے کر رو پڑی۔ اور
اُس کی آنکھوں سے دو آنسو نکل کر بڑی بی کے جھریوں والے
چہرے میں جذب ہو کر رہ گئے۔ یہ تھا ساس اور بہو کا ملاپ
جو بعد از وقت سہی لیکن صفیہ کو اس کے مشن میں کامیاب
کر گیا اور بڑی بی کے لمحۂ آخری کو آسان بنا گیا اور اُن کے
قلبِ طیبہ کو اطمینان کی سانس سے بہجت و سرور

سپنا

وہ شام برشگال! فضا غیر معمولی طور پر شگفتہ تھی اور مناظر قدرت روح پرور۔ آسمان پر اودے اودے بادل لہرا رہے تھے اور نکھرے ہوئے سرسبز پتوں پر خوش رنگ پھول سب کو دعوتِ دید دیتے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کسی خواب آور اثر سے کائنات مدہوش ہے اور ہمہ سرشار و خود فراموش۔

دن بھر کی کوفت کے بعد کوثر ابھی ابھی کام سے واپس ہوا تھا اس کے تھکے تھکے قدم بلا کسی خاص ارادہ کے ایک سمت کو اٹھ رہے تھے اور اُداس اُداس نگاہوں سے گہری گہری افسردگی عیاں تھی جیسے لذتِ چشیدۂ غم روزگار ہو اور نا آشنائے لطفِ بہار۔

نہ معلوم کب اور کس طرح وہ اپنے مکان تک پہنچا کیونکہ اس کے تخیلات تو ماضی کی طرف دوڑ رہے تھے اور روح

پر لامتناہی رنج و الم طاری تھا۔

اور پھر اس کیفیت پر برشگال نے تو اس کی دکھتی ہوئی رگ پکڑ لی تھی۔ آج اسے اس دو سال سے مانوس مکان سے وحشت ہو رہی تھی اور اس کے در و دیوار سے الجھن۔

"اُف! یہ حالت جمود کب تک؟" وہ دل ہی دل میں سوچنے لگا اور کھڑکی سے باہر کے منظر کا مشاہدہ کرنے لگا جہاں ننھے ننھے بچے معصوم کھیلوں میں مصروف تھے اور کاغذی کشتیاں بنا بنا کر پانی میں بہانے میں محو!

تصور نے کوثر کے سامنے اس کی سہ سالہ بچی ثروت لا کھڑی کی۔ ننھی سی معصوم ثروت! جس کے لئے وہ گزشتہ دو سال سے غربت میں ٹھوکریں کھا رہا تھا۔ محض اس لئے کہ اس کی بچی کو باپ کے جرم غربت کا کفارہ نہ ادا کرنا پڑے اور وہ بھوک سے تڑپ تڑپ کر جان نہ دے دے۔

کوثر کو وہ وقت اچھی طرح یاد تھا جس کے زیر اثر اسے اپنا گاؤں چھوڑنا پڑا تھا عزیز بیوی! اور پیاری بچی بھی۔

تین سال پیشتر جب کثرت باراں نے اس کے تیار کھیت کو برباد کر دیا تھا تو اس کی حالت بہت بری ہو گئی

تھی یہاں تک کہ بیوی کے چاندی کے زیور اور بچے کچھے برتن فروخت کر کے بمشکل تمام سرکاری مالیہ ادا ہو سکا تو روز دیگر کا خدا حافظ تھا وہ بھی متفکر ہو گیا اور خیال فردا سے لرزاں۔

گاؤں میں کوئی اور کام ملنا مشکل تھا اور بچوں کی حالت بھوک سے ناگفتہ بہ ہو رہی تھی۔ ناچار کوثر نے قریبی شہر میں جانے کا ارادہ کر لیا۔

شہر! یہ وہ پُراسرار سہ حرفی لفظ ہے جس سے اک سادہ لوح دیہاتی کے نہ معلوم کس قدر خواب وابستہ ہیں وہ رشک آمیز حیرت سے یہاں کی دولت کے مبالغہ آمیز قصے سنتا ہے اور اس جنت ارضی کو دیکھنے کا ہر لمحہ متمنی رہتا ہے جو الف لیلیٰ کے قصوں سے کہیں بڑھ کر حسین ہے اور اس کے روح پرور مناظر دست تخیل سے زیادہ تابناک۔

کوثر بھی انہیں خیالات کو حرز جان بنا کر گاؤں سے چلا تھا وہ سوچتا تھا کہ شہر میں پہنچنے کی دیر ہے دولت خود بخود ہاتھ باندھے آکھڑی ہو گی۔ پھر اُسے کبھی ابرو باراں کے رحم و کرم پر نہیں رہنا ہو گا بلکہ بلا کسی خاص مشقت کے اشیائے ضروری دستیاب ہو جایا کرینگی۔ اس وقت ہر

چہار طرف مسرت کا حصار ہوگا اور شادمانیوں کے انبار
بیوی اور بچی کو بھی بہت جلد اپنے پاس بُلا لینے کا وعدہ تھا
لیکن یہاں آ کر اسے اس تلخ حقیقت کا احساس ہوا کہ

بلبل کے کاروبار پہ ہیں خندہ ہائے گل

وہ خوش آیند منصوبے خواب و خیال ہو کر رہ گئے اور بیوی
ثروت کو اپنے پاس بُلا لینے کا ارادہ شرمندۂ تکمیل۔ نوبت
بہ اینجا رسید کہ جب باوجود سخت کوشش کے بھی اسے کہیں
سے کچھ کام نہ مل سکا تو مجبور ہو کر بیوی کو اطلاع دینی پڑی
جس نے گاؤں کے مہاجن کی منت و خوشامد کر کے کسی نہ کسی
طرح دس روپے روانہ کر دئے۔ [illegible] اور دلیر بھی
لیکن یہ خوبیاں تو پردۂ غربت میں [illegible] جاتی ہیں۔ وہ
اس دن پریشان تھا جب شہر کے [illegible] پاس
نکالا تھا۔ وہاں کم از کم کوئی تو وسیلہ ہوتی [illegible]
تو صاف کئی کئی وقت فاقے سے گزر جاتے اور کوئی پوچھنے
تک کا روادار نہ تھا

وہ واپس جانا چاہتا لیکن اس کے لئے پیسے درکار
تھے دوسرے اب خالی ہاتھ لوٹ جانے سے اسے ندامت محسوس ہوتی

انجام کار ایک فیکٹری میں بمشکل تمام جگہ مل گئی لیکن کام ایسا سخت اور صبر آزما تھا کہ شام تک وہ نڈھال ہو کر رہ جاتا اور اس مشقت کا معاوضہ کیا تھا۔ آٹھ جانسوز گھنٹوں کے عوض دس آنے جن میں سے بہت کم وہ اپنی ذات پر صرف کرتا اور باقی حفاظت سے ہر ہفتہ گاؤں میں بھیج دیا کرتا۔

دن اسی طرح بے کیف گزر رہے تھے۔ اور بظاہر کسی تبدیلی کی امید بھی نہ تھی

یکایک کوثر کو محسوس ہوا کہ وہ اپنے گاؤں میں پہنچ چکا ہے اور خراماں خراماں برسگالی جھونکے کھاتا اپنے مکان کی طرف رواں! وہی مانوس پگڈنڈیاں تھیں اور وہی دن بھر کی بارش کو جذب کرتے ہوئے شاداب کھیت۔

تالاب پر نوعمر لڑکیاں پانی بھر رہی تھیں۔ ان میں سے کئی نے کوثر کو شناخت کر لیا وہ اسے بنظر استحسان دیکھ رہی تھیں یا شاید دو سال پیشتر کے کوثر کا مقابلہ اس خوش پوشاک انسان سے کر رہی ہوں جس کا بڑا سا صندوق اس امر کا شاہد تھا کہ شہر کی تمام دولت سمٹ سمٹا کر اس میں بند ہو چکی ہے کئی لڑکیاں یہ خوشگوار خبر سنانے کے لئے اپنے اپنے گھروں کی

طرف روانہ ہوگئیں کہ خوش بخت کوثر دولتمند ہو کر واپس آیا ہے

چوپال پر اُس کے قدیمی رفقا بیٹھے تھے جنھوں نے بے لوث محبت اور سچی گرم جوشی سے اس کا استقبال کیا شہر میں بھی سادگی تو عنقا ہے۔ ان کے اس مشفقانہ برتاؤ سے کوثر کا قلب مسرت سے لبریز ہو گیا۔ اس کے واپس آنے سے سب نہال تھے اور شہر کے دلچسپ حالات سننے کے منتظر۔

کوثر نے وعدہ کیا کہ گھر والوں سے ملنے کے بعد وہ ضرور ضرور انھیں تمام خبریں سنائے گا۔ سامنے ہی نیم کے درخت کے پیچھے اُس کی جھونپڑی تھی جو آج معمول سے زیادہ خوشنما نظر آئی۔ وہ جی ہی جی میں دعا مانگ رہا تھا کہ اب تک جیدی کو اُس کی آمد کی خبر نہ پہنچی ہو۔

گھر کی چمنی سے خوشگوار دھواں باہر نکل رہا تھا جو سیاہ اور اودے بادلوں میں مل کر رہ جاتا اور اندر سے کسی چیز کے تلنے کی آواز آ رہی تھی۔ کوثر کو یاد آ گیا کہ برسات کے دنوں میں ہر سال اس کی بیوی میٹھی پوریاں تیار کیا کرتی تھی جنھیں وہ خاص چاہت سے کھاتا تھا۔ "زینب کے ہاتھ کی تیار کی ہوئی چیز لذیذ بھی بہت ہوتی ہے" اُس نے زیر لب کہا مجھے تو شہری کھانوں میں بھی کبھی ایسا لطف نہیں آیا جو گھر کی

سادی ترکاری میں ہوتا ہے" اچانک اُسے ثروت کی پیاری
پیاری آواز سنائی دی۔ اس کی بچی اب مینا کی طرح ملکاتی
پھیرتی ہے۔ اس افتخار سے کوثر کا سر بلند ہونے لگا۔ ثروت
ماں سے دریافت کر رہی تھی کہ پوریاں تیار ہو چکی ہیں یا نہیں؟
"ندا ابھی لو بیٹی!" زینب نے قدرے سکوت کے بعد جواب دیا۔
"کتنا اچھا ہوتا کہ آج تمھارے ابا بھی یہاں ہوتے وہ ان چیزوں
کے بہت شوقین ہیں۔ شہر میں تو کہاں ملتی ہونگی"
اب کوثر سے زیادہ ضبط نہ ہو سکا وہ بے اختیار
اندر داخل ہو گیا اور ثروت کو سینے سے چمٹا کر پیار کرنے لگا
جو پیشتر کی نسبت بیحد شگفتہ ہو چکی تھی اور از حد معصوم۔
زینب مسرت و حیرت کے ملے جلے جذبات سے
یہ سین دیکھ رہی تھی۔ "ربِ کعبہ! کیا کوئی آرزو اتنی جلدی
پوری ہو سکتی ہے" اُس پر ایک خواب کی سی کیفیت چھا رہی
تھی اور وہ اس وقت عالمِ علوی سے دنیائے ادنیٰ میں آئی
جب کوثر نے شہر سے خریدی ہوئی چیزیں باہر نکالنی شروع کیں
ایسے ایسے خوش رنگ اور قیمتی کپڑے۔ بھینی بھینی خوشبو والے
صابن اور سیلولائڈ کے بنے ہوئے کنگھے! زینب بےخود ہو کر

رہ گئی۔ وہ حیران ہو ہو کر ہر ایک چیز کو دیکھ رہی تھی اور
ننھی ثروت کھلونوں کے ڈھیر میں مصروف تھی۔

عورت فطرتاً رقیق القلب ہوتی ہے اور از حد
حساس! وہ خوشی کے موقع پر بھی ویسے ہی آنسو بہا سکتی ہے
جیسے کہ عالم الم میں اس کی آنکھوں سے خود بخود آنسو گرتے
رہتے ہیں چنانچہ زینب بھی اس مسرت فراواں کی تاب
نہ لا سکی اور اس کا احساس کوثر کو اس وقت ہوا جب وہ
اس کے کرخت بالوں میں انگلیوں سے شانہ کرتے کرتے خود
بخود رو پڑی اور اس کے چہرے کو آنسوؤں سے بھگو دیا۔ اگرچہ
یہ آنسو بڑھتی ہوئی مسرت کا اظہار تھے لیکن کوثر بے تاب
ہو گیا اور زینب کو تسلی دینے کے لئے اٹھنے ہی کو تھا کہ
اچانک اس کا سر کسی بھاری چیز سے ٹکرا گیا۔ شدت
تکلیف سے کراہتے ہوئے آنکھ جو کھولی تو اف! یہ تو وہی شہر
والا مکان تھا اور وہی اس کے وحشتناک در و دیوار۔۔

بارش اسی طرح ہو رہی تھی بلکتے ہوئے بچوں
کا غل بڑھتا جاتا تھا اور یہ آواز ہی تھی جس نے کوثر
کے روح پرور خواب کو ایک آوارہ خیال بنا دیا اسے اپنی

پیشانی پر بھی قطروں کی چند بوندیں محسوس ہوئیں جنھیں اک آہ سرد بھر کر اُس نے صاف کر دیا

کائنات کا ذرّہ ذرّہ بالیدہ تھا اور چپّہ چپّہ شاداب جیسے اطمینان پھوار کی صورت میں برس رہا ہو لیکن کوثر کو ایسا محسوس ہوا کہ زیست کا مزہ اُس کے لئے اور بھی تلخ ہو کر رہ گیا ہے۔
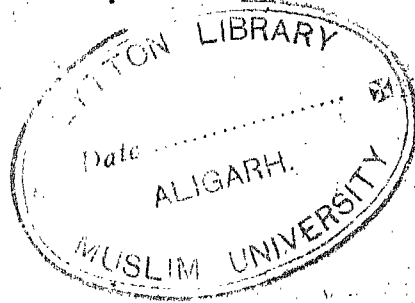
سڑک بن رہی تھی

مئی کی دوپہر تھی۔ چلچلاتی ہوئی دوپہر۔ ان دنوں
میں ہمارے مشرقی ممالک حدتِ گناہ سے بھی بڑھ کر گرم ہو جایا
کرتے ہیں۔ آسمان تپتے اور پگھلتے ہوئے تانبے کا سماں پیش
کرتا ہے اور زمین اک دہکتے اور سلگتے ہوئے انگارے کا نقش ثانی
ایسے وقت میں غربت کے خوفناک پنجے کی آہنی
گرفت میں تلملاتے ہوئے بیسیوں مزدور مصروفِ کار تھے
کیونکہ میونسپل کمیٹی کی سڑک بن رہی تھی۔ انکی آنسوؤں میں
ڈوبی ہوئی مایوس پکار فضا کو وحشت زدہ کر رہی تھی
اور کچھ فاصلے پر متعفن کپڑے میں لپٹا ہوا اک ننھا سا
بچہ چلا رہا تھا۔ زبانِ حال سے اپنی برنہ آنے والی خواہش کے
پورا ہونے پر مصر تھا۔ بیچارہ بچہ! اسے کیا معلوم کہ جور و استبداد
کی کرخت انگلیاں، اولاد کے حقوق بھی ماں باپ سے چھین
لیا کرتی ہیں اور مفلس کا سب سے بڑا جرم ہی یہ ہے

کہ وہ اس نیرو کی نائب اور شیطان کی شاگرد سرمایہ دار دنیا میں
جنم لیتی ہے خواہ یہاں کا ماحول اُسے پنپنے ہی نہ دے

غریب ماں نے بچہ کو ٹکٹکی لگائے اضطراری طور پر نظر
اُٹھائی - حدتِ آفتاب سے روح قالب میں اُلٹی جا رہی تھی - اس
قیامت کی گرمی میں بچہ کو شاہی جوئے شیر لانے سے کم
نہ تھا - اس پر مستزاد یہ کہ اُس کے جگر گوشہ کی آواز اُس کی
دنیائے تخیل کو متلاطم کر رہی تھی - آہ! ماں ہو کر بھی وہ مجبور تھی
کہ جذبۂ الفت کو کچل دے برباد کر دے اور کچھ دیر کے لئے بالکل
بھول جائے ورنہ آٹھ آنے مزدوری کے حاصل کرنا دشوار
ہی نہیں بلکہ ناممکن امر تھا -

اور بیچاری بالنصیب دختر اپنے لختِ جگر کی
فلک شگاف چیخیں سنتی تھی اسے چھوڑنے سے عاجز تھی -

اس کی ننھی سی جھونپڑی سہ نفوس پر مشتمل تھی -
ماں باپ اور یہی معصوم بچہ جو ان کے تاریک گھر کا اُجالا
تھا - بچہ کا مزدور باپ تمام دن کی سعی کے بعد آنا حاصل کر لیتا
کہ نوبت فاقہ کشی تک نہ پہنچتی تھی لیکن فلکِ کج رفتار کو یہ بھی
منظور نہ ہوا - ایک روز بیچارہ بخار سے بلبلاتا گھر میں گھسا تو آہ!

تک باہر نکلنا نصیب ہی نہ ہوا۔ بیماری اور اس پر مفلسی۔ ناچار بیوی
کو باہر نکلنا پڑا۔ دوزخِ شکم کے لئے ایندھن بھی تو ضروری چیز ہے
بچہ کو اسی طرح فرشِ خاک پر لٹا دیا جاتا۔ اڑتی ہوئی
ریت کے ذرّے اس کی حیران حیران معصوم آنکھوں میں پڑتے
تو وہ چلا اٹھتا اور وہ اس وقت تک چیختا رہتا جب تک کہ اس کا
گلا خشک نہ ہو جاتا۔ دھوپ کی زیادتی نے اس کے پھول سے
جسم کو ایک حد تک جھلسا دیا تھا لیکن ماں کو اجازت ہی نہ تھی کہ
شفقت بھری آغوش میں لے کر دو منٹ کے لئے اس کے ننھے
سے دل کو مسرور کر دے کیونکہ میونسپل کمیٹی کی سڑک
بن رہی تھی اور آٹھ آنے حاصل کرنے کیلئے اس کی ماں کو ایک
ایک لمحہ کا حساب دینا تھا۔

اب آفتاب پوری آب و تاب سے چمک رہا تھا
لوگوں کے بدن میں جیسے چنگاریاں لگ رہی ہوں بیچارہ
بچہ! وہ اب رو بھی نہ سکتا تھا۔ اس کے حلق میں
شدتِ تشنگی سے کانٹے سے پڑ رہے تھے اور مایوس نگاہیں کسی
کی آمد کی منتظر تھیں۔

بدقسمت ماں اب صبر نہ کر سکی ٹھیکیدار کی

ضرب المثل سنگدلی سے واقف ہوتے ہوئے بھی وہ اُٹھی اور
اک غیر اضطراری طور پر آگے بڑھنے لگی تاکہ اپنے بچے کو سینے
سے لگا کر کچھ دیر کے لئے دنیائے تخیل میں کھو جائے کہ اک
تحکمانہ آواز نے اُسے وہیں جامد و ساکت کر دیا

ٹھیکیدار صاحب گرج رہے تھے "ہزار مرتبہ منع کیا
ہے کہ کام کے دوران میں اُٹھا نہ جائے لیکن لوگوں پر کچھ اثر
نہیں اُلٹا کمبخت ہم سے گلہ کرتے ہیں کہ اُجرت کاٹی جاتی ہے"

"سرکار! میرا بچہ گرمی اور بھوک سے
مر جائے گا" وہ بمشکل تمام کہہ سکی۔

"مرتا ہے تو مرنے دو۔ ایسا ہی پیارا تھا تو اُسے تکلیف
دینے کی ضرورت ہی کیا تھی آرام سے گھر میں لئے بیٹھی رہتیں"

"لیکن ٹھیکیدار صاحب۔ کھانے کو تو ...."

"بس بس! میں رذیل اور کمینہ لوگوں سے بات کرنے
کا عادی نہیں ہوں۔ سیدھی طرح سے جا کر کام کرو"

بیچاری ماں۔ اُس کی جلتی ہوئی آنکھوں میں آنسو بھر
آئے۔ وہ ٹھٹکی پھر آگے بڑھی لیکن نتیجے کی ہولناکی اور اپنی
بے بسی کا خیال کرتے ہوئے وہیں ٹھہر گئی۔ اُس کی آنکھوں سے

یوں اشکِ رواں بہتے جیسے بادِ سحر کے لطیف جھونکوں سے پھول کی پتیوں پر سے شبنم کے قطرے پھسلتے ہیں

ٹھیکیدار کی بے رحم آنکھوں میں فاتحانہ چمک آ گئی اُس نے اپنے گرد و پیش اک متفخرانہ نظر ڈالی کہ بقیہ لوگوں پر اس تنبیہ کا کیا اثر ہوتا ہے اور اپنے کار ہائے نمایاں میں اضافہ کی خاطر کام کرتے ہوئے مزدوروں کے دوسرے گروہ کی طرف روانہ ہو گئے۔

بیکس ماں اک مغلوب سی حالت میں کام کر رہی تھی۔ اُس کی متغیر نظریں اپنے معصوم بچہ پر پڑ رہی تھیں جو ریت کے ڈھیر پر پڑا بوسیدہ کپڑوں کی اک چھوٹی سی گٹھڑی معلوم ہوتا تھا اور اُس کے فضا میں پھیلتے ہوئے ہاتھ ایسے معلوم ہوتے تھے جیسے شفیق ماں سے آنے کی التجا کر رہے ہوں لیکن وہ خاموش تھی ساکت و سحر زدہ۔

ایکا ایکی قریب سے مسرور قہقہوں نے اُسے چونکا دیا ٹھیکیدار صاحب کے دونوں لڑکے تھے۔ زندہ دلی کی تصویر اور پیکر ہائے شادمانی۔ یہ اپنی موٹر میں باپ کا کھانا پہنچانے آئے تھے جو انھیں مسرور دیکھ کر خود بھی شاد شاد تھا

اپنے لختِ جگر سے اُن کا موازنہ کرکے بدقسمت ماں
کے دل کی گہرائیوں سے اک آہ نکلنے لگی تھی لیکن اُس نے روکا
اور کمال بیدلی سے اپنے کٹھن کام میں مشغول ہو گئی

"ابّا ہم لیمونیڈ پئیں گے؟ برف والا لیمونیڈ!!"
ٹھیکیدار صاحب کے چھوٹے صاحبزادے نے کہا اور دوسرے ہی
لمحہ تینوں باپ بیٹے سامنے والی دوکان سے برف و لیمونیڈ لیکر
پی رہے تھے اور اپنے سرد قلب کو اور بھی منجمد بنا رہے تھے
حالانکہ اُن کے قریب ہی پڑے ہوئے ایک غریب بچے کے حلق
میں اس وقت شدّتِ تشنگی سے کانٹے پڑ چکے تھے لیکن انہیں
اس کی کیا پروا۔ وہ تو ایسے واقعات تقریباً ہر روز دیکھنے کے
عادی تھے ...... کچھ دیر کے بعد دونوں لڑکے اٹھے
اور گھر جانے کے ارادے سے موٹر اسٹارٹ کر دی

لیکن اُف! آف!! یہ کیا؟ فضاؤں میں یہ کس کی ننھی
سی چیخ تحلیل ہو کر رہ گئی۔ ماحول وفورِ گریہ سے لڑکھڑاتا ہوا
کیوں نظر آرہا ہے؟ بدنصیب ماں پاگلوں کی طرح اٹھی اور
دونوں ہاتھوں سے کلیجہ تھامے ہوئے بھاگی لیکن وہاں اب کیا تھا
گردشِ دوراں سے نالاں بچہ تو ٹھیکیدار صاحب کی کار سے

چکر کاٹتے ہوئے پہیئے میں آ کر رہ گیا تھا۔ مفلسی اور غربت تو ویسے بھی سرمایہ داری کی ہر بڑی سے بڑی چوٹ کھاتی آئی ہے اک ننھی سی جان کی بساط ہی کیا تھی۔

تھوڑی دیر کے بعد وہاں سکوت تھا ہر طرح کا سکوت ...... اور تمام کام حسب معمول انجام پا رہے تھے کیونکہ مزدوروں کے دلوں کی کمزور دھڑکن ٹھیکیدار کی جھڑکیوں کی بوچھار سے بند ہو چکی تھی اور وہ اُن کے پروانۂ خوشنودی کی خاطر طبیعت نہ چاہتے ہوئے بھی بددلی کی حالت میں مصروف کار تھے۔

البتہ کچھ فاصلے پر اک دیوانی سی عورت زار و قطار رو رہی تھی اک بوسیدہ کپڑے اور چند سکڑے ہوئے اعضا کو چوم چوم کر اُس زخمی پرندے کی طرح جس کے سینے میں گولی لگی ہوئی ہو تڑپ رہی تھی۔ تلملا رہی تھی اور کسی درد جانگداز کی کسک سے کانپ کانپ اُٹھتی تھی ...... یہ بیتی کی اُس گرم دوپہر کا ذکر ہے جب ایک نئی سڑک بن رہی تھی۔

* * *

ناکامِ آرزو

وہ بدنصیب ہوں جس کو نہیں سکون نصیب
اُس آشیاں میں ہوں راحت جس آشیاں میں نہیں

زندگی کے کتنے سنہرے خواب شرمندۂ تکمیل رہ جاتے ہیں اور منّت پذیرِ تعبیر! ورنہ جمالی کی مسکراتی ہوئی زندگی مسلسل گریہ ہو کر کیوں رہ جاتی اور درخشاں آرزوئیں شکارِ یاس و الم۔

آج سے پانچ سال پیشتر وہ چاہتا تھا کہ اُسکی ازدواجی زندگی صحیح معنوں میں کامیاب ثابت ہو اور ہر ایک کے لئے یادگار! اسی خیال کے زیر اثر اُس نے اپنے لئے شریکِ حیات بھی وہ منتخب کی تھی جو نہ صرف نسوانی خصوصیات سے ہی مزیّن تھی بلکہ حسنِ صورت کے ساتھ ساتھ پاکیزہ سیرت سے بھی آراستہ و پیراستہ

لیکن وائے برگشتگی طالع! کہ یہاں سے ہی اُسکی حیات کا تاریک پہلو شروع ہوتا ہے اور وہ داستانِ دردانگیز

جس کا انجام ایک بحد المناک باب پر تمام ہے

وہ چاہتا تھا اور یہی اُس کی سب سے بڑی آرزو بھی
کہ جس وقت وہ دن بھر کی تگ و دو کے بعد شکست شکست
قدموں سے گھر واپس آئے تو ناہید متبسم چہرے اور ضیا پاش
نگاہوں سے اُس کا استقبال کیا کرے تاکہ وہ اپنی کلفت و
پریشانی کو اُس کی حیات بخش مسکراہٹ کے آگے بھول جائے
اور روز دیگر کے تردّدات کو شامِ امروز میں دلفریبیوں میں
گُم کر دے لیکن آہ! وہ تمنا ہی کیا ہے جو حسرت ہو کر نہ رہ جائے
ناہید اُسکے خیالات سے بالکل ناواقف تھی اور بے بہرہ محض

اس میں شک نہیں کہ وہ اک مشرقی لڑکی تھی
اور شوہر کو خدائے مجازی سمجھتے ہوئے اس کے ہر حکم پر سر تسلیم خم
کرنیکو تیار لیکن اس کا کیا علاج! کہ وہ اپنی دنیا کو صرف مکان
کی چہار دیواری تک محدود سمجھتی اور دیگر تعلیم یافتہ لڑکیوں کے
برعکس دلی انہماک سے اُمور خانہ داری میں مصروف رہتی۔

ناہید کی والدہ اک قدامت پسند خاتون تھیں
جنھوں نے تعلیم جدید کے ساتھ ساتھ اک خاص معیار اپنی دختر
کے لئے مقرر کر دیا تھا جس کی حد سے آگے بڑھنے کی نہ تو ناہید

بس جرأت تھی اور نہ ہی وہ اسے پسند کرتی تھی اُسے جمالی کی
خدمت بجا لانے میں روحانی سکون محسوس ہوتا اور وہ اُسے
اپنا اہم اور منصبی فرض سمجھتی۔

لیکن جمالی! اُف! کیا وہ خوش تھا؟ اس غریب کے
حسین خواب سینکڑوں بار خون غلطیدہ ہو کر رہ جاتے تاہم وہ
خاموش تھا اور کسی موقع کا منتظر۔

(۲)

میں وہ نامرادِ زمانہ ہوں مرا مدتوں سے یہ حال ہے
کہ نہ اُن کو میرا خیال ہے نہ مجھے مجالِ سوال ہے

وقت سرعت سے گزر رہا تھا لیکن جمالی کی بے کیف
زندگی میں ہنوز روزِ اوّل کا سا معاملہ تھا یہی وجہ تھی کہ وہ
ناہید کو از حد پسند کرتے ہوئے بھی اس سے ناراض رہنے پر
مجبور ہو گیا اور اس مغائرت کی وجہ اس کی ساس تھی جو جہاں
دیدہ ہوتے ہوئے بھی بے خبری کے عالم میں اپنی بیٹی کے لئے
کانٹے بو رہی تھی چنانچہ جمالی اس دن کو کبھی فراموش نہ کر سکا
جب ہلکی ہلکی پھوار روح کو طمانیت عطا کر رہی تھی اور قلب کو
سرور۔ اسی حالتِ انبساط میں اس نے بھول کر ناہید کو سیر

کے لئے چلنے کو کہہ دیا تھا جس پر ناہید کچھ اس طرح چپ ہو گئی تھی جیسے اُس نے کوئی غیر معمولی سی بات سُنی ہو اور آخر میں یہ کہہ کر انکار کر دیا تھا کہ "امی جان کی مرضی نہیں کہ ایسے بُرے موسم میں باہر نکلا جائے اور شریف گھرانوں کی خواتین کو تو ویسے بھی احتیاط لازم ہے"

اِن الفاظ سے جمالی کا خون کھول اُٹھا تھا۔ گویا کہ اپنی بیوی کو ہمراہ لے جانے کا بھی اُسے حق حاصل نہیں تھا اور اس کے لئے بھی ساس صاحبہ کا پروانۂ خوشنودی حاصل کرنا تھا لیکن وہ خون کے گھونٹ پی کر رہ گیا اور کسی موزوں موقع کا انتظار کرنے لگا۔

موقع بھی جلد ہی ہاتھ آ گیا۔ جمالی کا ایک دوست تھا شاہد! جو کہ نہایت شریف النفس نوجوان تھا اور قابل اعتماد دوست! اس مرتبہ جب وہ تعطیلات میں جمالی سے ملنے آیا تو جمالی نے اُسے ناہید سے متعارف کرا دینے میں کوئی قباحت نہ سمجھی کیونکہ اگر اُسے بیوی کے بعد کسی ہستی سے کبھی دلچسپی ہوئی تو وہ یہی شاہد تھا جسے جمالی نہ صرف اپنا ایک ازدار دوست ہی سمجھتا بلکہ برادرِ خورد بھی۔

بات بھی معمولی تھی لیکن اس کا نتیجہ! اللہ!!
وہ کیسا تلخ نکلا کہ بیچارے جمالی کا رہا سہا سکون بھی مبدل بہ
سکوت ہو کر رہ گیا۔ ناہید کی والدہ نہیں چاہتی تھی کہ اُنکی دختر
ایک غیر مرد کے سامنے بے پردہ جائے کیونکہ یہ اُن کے خاندانی
رسم و رواج سے بالکل بعید تھا۔ وہ برداشت نہیں کر سکتی تھیں
کہ بعد میں کسی کو انگشت ملامت اٹھانے کا موقع دیا جائے
رہی ناہید! اُسے اگر شوہر سے بے حد محبت تھی تو ماں سے
عقیدت بھی کچھ کم نہ تھی۔

وہ اک تذبذب کی حالت میں تھی کہ جمالی نے
موقع کی نزاکت کا اندازہ لگاتے ہوئے خود ہی بات ٹال دی
اور ناہید سے کہہ دیا کہ اگر شاہد کے سامنے آنے میں اُسے
کچھ پس و پیش ہو تو وہ بھی زیادہ اصرار نہیں کرتا

ناہید اور اُس کی والدہ نے اس امر کو کچھ اہمیت نہ
دی کہ اُن کے اس دلشکن رویہ سے جمالی کی کیا حالت ہوئی ہوگی
اور اسے کس قدر روحانی تکلیف برداشت کرنی پڑی ہے

(۳)

اپنی بربادی کو ہم دیکھا کریں آنکھوں سے لب ہلائیں نہ مگر درد سے نالہ نہ کریں

جمالی جیسی حساس ہستی کے لئے یہ بوجھ ناقابل برداشت تھا۔ ہر آنے والا لمحہ اس کے قلب کو افسردہ کر رہا تھا اور روح کو پژمردہ۔

اس کی ہر ممکن کوشش ہوتی کہ باہر کی دلچسپیوں میں گھر کی متوحش کن فضا کو فراموش کر دے لیکن بے سود وہ اپنے آپ کو اک بھیانک صحرا میں محسوس کرتا۔ چٹیل اور طول طویل صحرا! جہاں نہ کوئی شجر سایہ دار نظر آتا نہ کوئی راہبر۔ دولت اور اعلیٰ اسوسائٹی بھی اس ناسور کو مندمل نہیں کر سکتی تھی جو اس کے دل کی گہرائیوں سے آہستہ آہستہ رس رہا تھا لیکن ناہید! وہ جمالی کی متغیر حالت کا روز فکر مند نگاہوں سے مشاہدہ کرتی۔ اس کی صحت کے لئے گڑگڑا گڑگڑا کر دعائیں مانگتی مگر افسوس کہ خود معالج ہوتے ہوئے بھی طریق علاج سے بے بہرہ تھی۔

اور پانچ سال کا طویل عرصہ یونہیں گزر گیا اسی زہریلے ماحول میں جہاں جمالی کی روح مسموم ہو رہی تھی اور ہستی اک ناقابل برداشت بوجھ۔

اس کے بس میں نہیں تھا کہ وہ اس ناکام

زندگی کا خاتمہ کر دیتا جس میں نام کو بھی تابندگی نہیں تھی جس کی آرزوئیں ناتمام رہی جاتی تھیں اور تمنائیں ناکام

اس عرصہ میں کئی بار برشگال کے روح افزا جھونکوں نے کائنات کو حیاتِ نو عطا کی لیکن جمالی تجدیدِ زیست سے محروم ہی رہا۔ گو صورتِ حال حد سے زیادہ بڑھ چکی تھی لیکن پھر بھی وہ قلبِ طپیدہ کو سنبھالے ساکت تھا اور شاید کسی خاص موقع کا منتظر۔

(۴)

تغافل کیش! تجھ کو کیا خبر یہ کیا قیامت ہے

یہ اک صبر آزما غم ہے یہ اک جانسوز آفت ہے

"[illegible] پیہم تسلسل سے تنگ آچکا ہوں ناہید!"
آخر ایک روز جمالی نے کوئی سعی کارگر نہ ہوتے دیکھ کر کہا

"اس گھر میں میرے لئے کوئی دلچسپی باقی نہیں رہی"

"تو! تو!! اس میں میرا کیا قصور"! ناہید نے معصومیت سے جواب دیا "میری تو ہر ممکن سعی یہی رہی ہے کہ آپ کو کسی بھی قسم کی تکلیف نہ ہونے پائے"

"جسمانی تکلیف کیسی ناہید! میں گرفتارِ خلشِ روحانی

ہوں۔ آہ! کاش!! کہ تم اس کا کچھ مداوا کرتیں۔ اُف! پانچ سال کا طویل عرصہ اسی آرزو میں گزر گیا لیکن میری تمناؤں نے کبھی کامرانی کا منہ نہ دیکھا۔

"اگر آپ کو کھانا حسبِ پسند نہیں ملتا یا آرام میں کسی قسم کا حرج ہوتا ہے تو مجھے بتا دیجئے۔ آئندہ کے لئے اُس کا بندوبست ہو جائے گا"

"کاش کہ تم میری ہستی سے بیزار روح کا بھی کچھ بندوبست کرتیں جس کے لئے یہ دنیا جہنم بنی ہوئی ہے اور اس کی آرائشیں دہکتے ہوئے انگارے۔ اُف! میں تنگ آ چکا ہوں اور اس بےکار ہستی سے بیزار ہوں"

"یہ آپ آج کیسی باتیں کر رہے ہیں! خدانخواستہ طبیعت تو خراب نہیں"

"ہاں میں علیل ہوں لیکن روحانی!! آبِ حیات پلانا تمہارے ہاتھ میں تھا لیکن اس معصومیت اور تمہارے تغافل نے تو مجھے صاحبِ فراش کر دینے پر کمر باندھی ہے"

"خدا نہ کرے" ناہید گلوگیر ہو کر بولی "ٹھہریے میں ابھی امی جان سے کوئی نسخہ پوچھ کر بتاتی ہوں کہ آپ کو

روز بروز کیا ہوتا جاتا ہے"

جمالی کو در و دیوار گھومتے نظر آنے لگے اور دہ کسی برگ کاہیدہ کی طرح لرزاں۔ اُس کے الفاظ ناہید کی سمجھ سے بالاتر تھے۔ اس کی ہستی ناہید کے لئے اک معمہ تھی اور اُسکے خیالات اک گورکھ دھندا۔

(۵)

ہر سں بھی کارواں بھی ہوں میں رہبر اور رہزن بھی
میں ہوں گم کردہ منزل بھی، نشانِ راہ منزل بھی

دوسری صبح جب امی جان کے حسب ہدایت نسخہ تیار کر کے ناہید کمرے میں داخل ہوئی تو جمالی کی جگہ میز پر ایک لفافہ دیکھ کر ہکا بکا رہ گئی۔ اُس کے ہاتھ کی بنی ہوئی دوا پئے بغیر وہ کہاں چلے گئے؟ یہ خیال اسے حیران کر رہا تھا اور پھر خلافِ معمول قبل از وقت گھر سے چلے جانا چہ معنی دارد۔

اور خط میں لکھا تھا

میں جا رہا ہوں۔ کبھی لوٹ کر نہ آنے کے لئے!! کسی ایسی جگہ جہاں میری روح کو آوارہ نہیں پھرنا پڑیگا اور نہ قلب منجمد ہوتے ہوئے اپنی حسیات کھو دے گا

زندگی کا ہر سُکھ میرے لئے دُکھ بن کر رہ گیا تھا
اور ہر راحت کسی آنیوالی آفت کا پیش خیمہ تھی
شاید جلا وطنی ہی تپ زدہ ہستی کو قدرے
تازگی عطا کر سکے"

"جمالی"

باہر برآمدے میں آفتاب کی پہلی کرن لرز رہی تھی۔ اُن آنسوؤں کی طرح جو ناہید کی شفاف آنکھوں میں کانپ رہے تھے اور وہ اس خیال میں غلطاں تھی کہ آخر اس خط کے لکھنے کا کیا مقصد ہے جس کے مفہوم تک سے وہ ناآشنا ہے اور جمالی کون سے قصور کی بنا پر اُسے چھوڑ کر چلے گئے اور وہ بھی ہمیشہ ہمیشہ کے لئے۔

تفاوت

شب کے گہرے گہرے سکوت کو گھنٹے کی ٹن ٹن نے توڑ دیا۔ شیریں یکبارگی جیسے خواب پریشاں سے چونک اٹھی ہو اس کی بھاری پلکیں نیند کے بوجھ سے خود بخود جھکی جاتی تھیں اور انداز کسلمندی سے صاف ظاہر تھا کہ مسلسل کئی راتوں سے سو نہیں سکی ہے۔

وہ نیند سے پیچھا چھڑانے کے لئے باہر بیٹھنے لگی۔ ستارے نیلے آسمان پر باسی پھولوں کی طرح نظر آرہے تھے۔ چاند کا رنگ قدرے مدھم پڑ گیا تھا اور بادل ایک ایک کر کے فضائے آسمانی میں منتشر ہو رہے تھے۔

شیریں کی آرزوئیں بھی تخیل ہی تخیل تھیں مسرتوں کا اتفاق بن کر رہی تھیں گزشتہ ایک ماہ سے اسکا سرتاج بیمار تھا اور وہ دنیا و مافیہا سے بے خبر اس کی تیمارداری میں مصروف تھی اگرچہ ڈاکٹروں کا تو یہی کہنا تھا کہ معمولی سا موسمی بخار ہے لیکن اس کے

جی کو قرار نہ تھا۔ آج خالد کے بخار کا تیسواں روز تھا۔ اسی لئے شیریں بھی جاگ رہی تھی تاکہ وقت پر دوا کی آخری خوراک دے سکے

دریچہ سے سرد ہوا کے جھونکے آرہے تھے شیریں نے اُسے بند کر دیا۔ آہٹ سے خالد کی آنکھ کھُل گئی۔ بیوی کو ابھی تک جاگتے دیکھ کر اُسے بیحد ملال ہوا اور قدرے آشفتگی سے بولا۔

"شیریں! آخر تم ہاتھ دھو کر اپنی صحت کے پیچھے کیوں پڑی ہو۔ پچھلی کئی راتوں سے تمھیں پوری طرح سونے کا موقع نہیں ملا لیکن اب تو میں تندرست ہو رہا ہوں پھر بھی تمھارا وہی حال ہے"

"آپ کے اچھا ہونے کی دیر ہے پھر آرام سے ہی تو سونا ہے۔ بہر حال اب زیادہ باتیں نہ کیجئے۔ یہ آخری خوراک رہ گئی ہے۔ اسے پی کر کچھ اور نیند لے لیجئے"

اور خالد والہانہ عقیدت سے اُس کے حسین چہرے کو دیکھنے لگا جسے فکر اور تھکن نے قدرے پژمردہ کر دیا تھا

آج خالد کا غسل صحت تھا۔ شیریں کی مسرت کا اندازہ مشکل تھا وہ خود بخود اک کلی کی طرح کھلتی جا رہی تھی اسی خوشی میں اک دعوتِ عام بھی بڑے پیمانے پر دی گئی جس کا اہتمام وہ بہ نفسِ نفیس کر رہی تھی۔

دن بھر کی تگ و دو کے بعد شام کو کچھ سستانے کا موقع ملا۔ شیریں اک آرام کرسی پر آنکھیں بند کئے ہوئے لیٹی ہوئی تھی کہ خالد بھی دوستوں سے نپٹ کر ادھر ہی چلا آیا اور قریب کے صوفے پر بیٹھتے ہوئے اک بیخودانہ انداز سے گویا ہوا۔

"شیریں! تم نے جس خلوص، الفت اور جانفشانی سے میری تیمارداری کی ہے اُسکا تو اعادہ ہی فضول ہے تاہم میری طرف سے یہ حقیر سا ہدیہ قبول کرو۔ آج کے خوشگوار دن کی یادگار کے طور پر سہی"

اور جیب سے اک درخشاں طلائی ہار نکال کر اُس کے مرمریں گلے میں ڈال دیا۔

"تو گویا یہ میری خدمات کا معاوضہ ہے" شیریں نے ہنسکر کہا "لیکن یہ تو اُس روحانی ارتباط کی قیمت تو نہیں ہو سکتی جو مجھے آپ کے ساتھ ہے"

"اوہ! نہیں شیریں! تمھاری پُرخلوص خدمات کا معاوضہ دینے کی مجھ میں جرأت ہی کب ہے تاہم یہ آرزو ضرور ہے کہ کاش مجھے بھی تمھاری کوئی خدمت بجا لانے کا موقع مل سکتا"

"خدا نہ کرے" شیریں مسکراتے ہوئے بولی "کہ میں اپنے کام آپ سے کراؤں۔ میں نے جو کچھ کیا وہ بہر حال ایک فرض ہی تھا لیکن

یہ تو ا نی ہوئی بات ہے کہ بعض شوہر بیمار بیوی کی صورت سے ہی گھبراتے ہیں"

"تو کیا تم مجھے بھی ان میں ہی شمار کرتی ہو" خالد نے بناوٹی خفگی سے کہا "یہ تو تمھاری زیادتی ہے شیریں! میں ایسے احسان فراموش لوگوں میں سے نہیں"

شاید وہ لمحہ باب اجابت کے وا ہونے کا تھا کیونکہ اس گفتگو کے چند روز بعد ہی شیریں کی طبیعت دفعتاً خراب ہوگئی اس نے معمولی سی بات سمجھ کر زیادہ توجہ نہ کی اور نوبت بہ اینجا رسید کہ صحت گرتے گرتے بالکل ستیاناس ہو کر رہ گئی۔ یہ سب کچھ اسقدر جلد ہو گیا کہ خالد اور شیریں معاملہ کا اندازہ بھی نہ کر سکے کہ مرض کی نوعیت کیا ہے ہر آنیوالی چمکیلی صبح، سوادِ شب میں تبدیل ہوتی رہی اور اسی کے ساتھ ساتھ شیریں کا مرض بھی ترقی پذیر تھا آخر وہ "شور شہہائے بزم جہاں سے بے نیاز ہوگئی اور بالکل صاحب فراش"

خالد کو اپنا وعدہ یاد تھا اور وہ وقت بھی کبھی نہ بھول سکتا تھا جب اسکی شیریں نے محض اسکے لئے کئی راتیں بیداری میں گزاری تھیں اور اپنی صحت کو اس پر قربان کر دیا تھا

لیکن یہ سرگرمی بہت جلد سرد مہری میں بدلنے لگی۔

خالد اک لاابالی طبیعت کا انسان تھا اور صحت و تندرستی کا ساتھی وہ اس لمحہ پر نفرین بھیجتا جب اس قسم کے کلمات اُس کی زبان سے نکلے تھے رفتہ رفتہ اُس کے اطوار میں فرق آنے لگا پہلے تو مکان میں آنے کا وقت بدل گیا اور پھر مستقل رہنا ہی مردانے کا ہو گیا

شیریں تمام حالات کا اک سکوت کے عالم میں مشاہدہ کر رہی تھی لیکن وہ مجبور تھی اور اک ہستی بے کار محض! جس کی ذات خالد کے لئے اک عذاب ہو کر رہ گئی تھی وہ اپنی قسمت نامہربان پر خون کے آنسو روتی اور جلد از جلد موت آنے کی دعائیں مانگتی تاکہ خالد کو زیادہ زیر بار مصائب نہ ہونا پڑے

وقت اپنی رفتار سے گزر رہا تھا اور اک شگفتہ و مرمریں پیکر کی جگہ ہڈیوں کے ڈھانچے نے لے لی تھی جس کی چمکیلی آنکھوں کی تابانی نہاں تھی اور خوشنما چہرے کی تازگی مفقود

اور خالد! وہ تو کئی روز سے مکان میں بالکل آ ہی نہ سکا۔ نہ معلوم کون سے کار ہائے دراز تھے جن سے چھٹکارا پانے کی اُسے مہلت نہ مل سکی۔ اور وہ فریب وعدہ! وہ تو اُسے قطعاً فراموش ہو چکا تھا۔ عہد وفا اب ٹوٹ چکا تھا اور شیریں کا نازک شیشۂ دل پیہم ٹھیسوں سے چکنا چور۔ تاہم اُسے خالد سے

کوئی گلہ نہیں تھا اور نہ ہی اس کی بے اعتنائی کی شکایت۔

مسلسل دو ہفتہ غائب از نظر رہنے کے بعد آج خالد اندر آیا اور وہ بھی اک بیحد ضروری کام کے لئے۔ شیریں فرطِ نقاہت سے اک عالم خود فراموشی میں چارپائی پر لیٹی تھی۔ اپنے اگلے وجود کا محض اک سایہ شیریں! اس کے زرد لب کانپ رہے تھے اور خالد نے کچھ ندامت سے سنا کہ ان سے آہستہ آہستہ یہ الفاظ ادا ہو رہے تھے۔

ہے تمہاری بھی عجب سخت طبیعت بخدا   رحم دل میں نہ رہا
منتیں کرتے رہے ہم تمہیں نفرت ہی رہی   پاس بیٹھے نہ ذرا

وہ کچھ جھجکا تھا اور واپس لوٹنے کو تھا کہ پھر آگے بڑھا اور چارپائی کے پاس جا کر کھڑا ہو گیا۔ شیریں اب بھی لاعلم تھی کہ کمرے میں کوئی داخل ہوا ہے۔ اس لئے خالد نے اس کی محویت توڑنے کی غرض سے کہا "شیریں! میں تم سے اک بیحد ضروری امر میں مشورہ لینے آیا ہوں"

اور شیریں کو ایسا معلوم ہوا کہ اس کا خالد اسے عالم خواب میں پکار رہا ہے۔

"جی فرمائیے" اس نے دھیرے سے جواب دیا

گویا کہ ڈرتھا کہ کہیں طلسم ٹوٹ کر نہ رہ جائے
لیکن رفتہ رفتہ وہ آنکھیں خود بخود وا ہوگئیں جو اب بے ثباتی دہر کا مرقع تھیں اور سینکڑوں دم توڑتی ہوئی آرزوؤں کی تفسیر۔
"شکر ہے کہ آج تو آپ کو آنے کی فرصت ملی" اُس نے اٹک اٹک کر کہا اور حسرت زدہ نگاہیں خالد کے چہرے پر گاڑ دیں۔
"وقت تو میرے پاس اس وقت بھی نہیں لیکن یہ بات ہی کچھ ایسی ضروری تھی" خالد نے شیریں کے احساسات کی پروا کئے بغیر کہا "اور وہ یہ کہ تمہاری بیماری تو نہ معلوم کبھی ختم بھی ہوتی ہے یا نہیں اور یہاں مکان کا نظام ہی بگڑتا جاتا ہے میں تم سے صرف یہ کہنے آیا ہوں کہ اگر تم کو ناگوار نہ ہو تو میں اپنے دفتر کے بابو احمد سعید کی دختر سے شادی کرلوں"
خالد کا خیال تھا کہ شیریں یہ الفاظ سنتے ہی چیخ چیخ کر فضا میں تہلکہ مچادیگی۔ اپنی بنی بنائی دنیا کو بگڑتے دیکھ کر خود بھی دماغی توازن کھودیگی اور اس کے بہتے ہوئے اشک در و دیوار کو نمناک کردیں گے لیکن برعکس اس کے وہ ساکت رہی اور کسی اضطراری حرکت تک کے نا قابل۔

اور پھر! خالد نے چشم حیرت سے دیکھا کہ اُسکی لرزتی ہوئی
انگلیوں نے گلے سے وہ طلائی ہار نکالنا شروع کیا جو خالد نے تیمارداری
کے صلے میں عطا کیا تھا اور ان الفاظ کے ساتھ اُسکے ہاتھ میں تھما دیا
"یہ بھی اب آپکی نئی بیوی ہی کے کام آئیگا" اگرچہ ہونٹ متحرک تھے
اور آنسو مچلنے کو بے قرار۔ قلب کی گہرائیوں سے دھواں سا اُٹھ
رہا تھا اور علالت سے کمزور دماغ پر اک سنسناہٹ سی طاری لیکن
زبان کو یارائے گفتگو نہ تھا اور نہ ہی کچھ کہنے سننے کی طاقت۔
مقدس معبود! اسقدر تفاوت تھا شیریں کے نقطۂ نگاہ
اور خالد کے زاویۂ نظر میں۔ کیسا گہرا تفاوت۔ اوّل الذکر اپنے
محب کو معمولی سے مرض میں گرفتار دیکھ کر بیقرار ہوگئی تھی۔ بیگانہ
از خرد و حواس اور غرق دریائے خود فراموشی اور موخرالذکر
اُس ہستی کو بیماری سے جدوجہد کرتے دیکھ کر بے زار تھا
اُس کی قضا کا متمنی۔ بہ یک جنبش لب، جذبات لطیف کو
مجروح کرنے پر کمربستہ اور نہ معلوم کب کے قائم کئے ہوئے
ہوائی قلعوں کے ڈھانے کو تیار۔

دھوکا

"فرحت! تمھیں یہ نہیں بھولنا چاہئے کہ میں تم سے بہر صورت بزرگ ہوں اور جو کچھ بھی کروں گی۔ اپنی رفعت کی بہبود کو مدنظر رکھتے ہوئے کرونگی"

"آپ کا فرمانا بجا ہے امی جان! لیکن اگر اس فیصلے پر نظرثانی ہو جائے تو کیا ہرج ہے"

"مگر اس کی ضرورت ہی کیا ہے جب کہ میں ہر پہلو کو سامنے رکھ کر غور کر چکی ہوں۔ تمھیں کل کی بچی ہو کر ہر معاملے میں دخل نہیں دینا چاہیئے رفعت"

"اس جسارت کے لئے معافی چاہتی ہوں۔ تاہم یہ عرض کئے بغیر نہیں رہ سکتی کہ کاش! کاش!! آپ رفعت کو اعلیٰ التعلیم نہ دلاتیں تاکہ وہ جذبۂ احساس سے عاری ہی رہتی لیکن اب تو وہ گھٹ کر رہ جائے گی مگر حرف شکایت زبان پہ نہ لائے گی اور یاد رکھئے کہ اس کی شگفتہ آرزوؤں کو خون غلطیدہ

کر دینے کی ذمہ دار آپ ہونگی"

"بس لڑکی! خدا کے لئے بس کر" ممتاز بیگم چیں بہ جبیں ہو کر بولیں" یہ اسی تعلیم کا ہی تو اثر ہے کہ تمھیں بڑھ بڑھ کر باتیں بنانے کی جراًت ہوئی دیکھوں تو رفعت کے بارے میں مجھے کون ٹوک سکتا ہے" اور وہ وندناتی ہوئی کمرے سے باہر نکل گئیں۔

(۲)

اس واقعہ کے دو یا تین روز بعد کا ذکر ہے کہ رفعت اپنے کمرے میں افسردہ وساکت بیٹھی تھی۔ شفاف جبیں پر گہری گہری شکنیں کسی مخفی الم کا پتا دے رہی تھیں اور نرگسی آنکھوں میں ڈبڈبائے ہوئے آنسو اذیت روحانی کے شاہد تھے۔ اسے اچھی طرح معلوم تھا کہ نا سمجھ ماں اسے اپنی خواہشوں کی بھینٹ چڑھا رہی ہے لیکن وہ ماں کے مقابل خاموش تھی اور نہ ہی کچھ تکرار کرنے کی جرأت۔

اس کے پیش نظر ایک تاریک مستقبل تھا۔ شرمندہ ناکامی اور محروم از درخشانی لیکن یہ اس کی پہنچ سے باہر تھا کہ اپنی تجدید حیات کے لئے کچھ کرے کیونکہ وہ اچھی طرح سے جانتی

تھی کہ ایک سچی دختر ہند کے لئے زندگی کا ماحصل شروع
ہی سے یہ رہا ہے کہ ؎

نہ تڑپنے کی اجازت ہے نہ فریاد کی ہے
گھٹ کے مر جاؤں یہ مرضی مرے صیاد کی ہے

کی مثال کو اپنے اوپر صادق کر کے دکھائے اور اُس کے لئے
وہ ثابت قدم رہنے کا تہیہ کر چکی تھی بعض اوقات اُسے ایسا
محسوس ہوتا کہ روح بغاوت پر آمادہ ہو رہی ہے اور ذراتِ
حیات سکون کی تلاش میں بے قرار ہیں لیکن وہ دلِ زبوں
حال کو تسلی دیتی اور نگاہیں وسیع و دھندلی خلا میں جما دیتی
جہاں محض تاریکی ہی تاریکی تھی۔

(۳)

فرحت کی ہر سعی آج تک سعی ناکام رہی تھی۔ باوجود
سینکڑوں خوشامدوں کے بھی وہ اپنی ماں کو رام کرنے سے
معذور رہی۔ ممتاز بیگم اپنی ضد پر اب تک قائم تھیں اور وہ یہ
کہ رفعت کا رفیقِ حیات اگر کوئی ہو سکتا ہے تو وہ مولوی
سعد الاسلام ہی ہیں۔ اگر خیالات میں کچھ تفاوت ہو اور عمر میں
قدرے فرق (محض بیس برس کا) تو اُس کے یہ تو معنی نہیں کہ

اُس کا مستقبل ہی کامیاب ثابت نہ ہوگا۔ فرحت کہتی کہ رفعت کو چونکہ تعلیم جدید سے روشناس کرایا گیا ہے اس لیے وہ کسی بھی صورت میں اس بات کو پسند نہ کرے گی لیکن ممتاز بیگم تھیں کہ ان تمام نکتوں سے بے پروا اپنے الفاظ پر ہی قائم تھیں

فرحت غریب کے زیادہ اصرار کا یہ اثر ہوا کہ پیچھے جھاڑ کر اُس کے پیچھے پڑ گئیں کہ "تم شاید چاہتی ہو کہ اپنی رفعت کو کیفی (فرحت کے شوہر) کے چھوٹے بھائی سے وابستہ کردوں اور وہ محض اس لیے کہ اُس نے بڑی بڑی ڈگریاں حاصل کرلی ہیں نیز رفعت کو بھی پسند کرتا ہے لیکن اچھی طرح سے سُن لو کہ یہ ناممکن ہے قطعی ناممکن! وہ تو تمھارے والد مرحوم ہی اتنے آزاد خیال تھے کہ کیفی کے ہاتھوں تمھیں سونپ گئے اور اُس کا نتیجہ بڑھتی ہوئی آزادی ہی نکلا نا؟ جو سر لمحہ میری نگاہوں میں خار کی طرح کھٹکتی ہے لیکن اس زہریلے اثر سے رفعت کو بچانا تو میرا فرض ہی ہے اور یہ صرف اسی صورت میں ہوسکتا ہے کہ مولوی سعد الاسلام کو ئی وسیلہ ہماری نجات کا نکالیں"

فرحت دم بخود تھی اور ماں کی ترپاہٹ کے آگے بے بس! لیکن اُس نے تہیہ کرلیا کہ تاحدِّ امکان اپنی بے زبان

بہن کی مدد کرے گی اور اس ذلیل فطرت مولوی کی دست برُد
سے بچا لے گی جو کہ پہلے ہی تین بیویوں کا شوہر ہے اور اب چوتھی
کی آمد آمد کا منتظر، جو عمر میں کسی صورت میں بھی اُس کی اپنی
بیٹیوں سے بڑی نہ تھی۔

(۴)

ممتاز بیگم حیران تھیں کہ گزشتہ چند روز سے
فرحت نے یہ ذکر بالکل نہیں چھیڑا برعکس اسکے شادی کی تیاریوں
میں خوش خوش حصہ لے رہی تھی وہ اسے اپنی جیت سمجھیں کہ آخر
اسے لاجواب کر ہی دیا۔ تاہم اب تو شادی کے دن قریب آ رہے تھے
اس لئے یہ خدشہ بھی نہ تھا کہ وہ عین وقت پر کچھ اختلاف کرے گی
برخلاف اس کے زینت بزیب کی حالت قابل رحم تھی۔ وہ مولوی
کے تو تصور ہی سے لرزاں تھی اور ان پرُشور تیاریوں سے
ترساں، بقول کسے ؎

ہنستے جو دیکھتے ہیں کسی کو کسی سے ہم
منہ دیکھ دیکھ روتے ہیں کس بیکسی سے ہم

تاہم اس امر پر گفتگو کی اُسے مجال نہ تھی اور نہ ہی خوابوں کی تعبیر
پریشاں پر چپکے چپکے رونے کے سوا کچھ چارا۔

اور اب اُس کی قسمت کا فیصلہ ہونے میں صرف ایک ہفتہ رہ گیا تھا مگر کوئی شعاعِ اُمید نظر نہ آتی تھی ماسوا اس کے کہ فرشتۂ اجل کو خوش آمدید کہنے کے لئے تیار ہو جائے مگر مذہب کا خوف بار بار یہ ارادہ پست کر دیتا اور مردہ بدست زندہ وقت گزارنے پر مجبور۔ اُسے اپنی عزیز آپا فرحت سے مخلصانہ گلہ تھا کہ ان میں ایکا ایکی یہ تبدیلی کیونکر ہوگئی اور باوجود اس قدر مخالفت کے وہ اماں جان کی ہم خیال کیونکر بن گئیں۔

حیرت پر حیرت کہ اتنے روشن خیال اور ایسے بیدار مغز دو طعابھائی بھی تو امی جان کا ہاتھ بٹانے پر کمربستہ تھے اور ہر ممکن امداد کو تیار۔ جوں جوں وہ اس معاملہ پر غور کرتی یہ سلسلہ پیچیدہ ہی ہوتا جاتا یہاں تک کہ اس کی افسردہ ہستی پر غم آگین ارتعاش طاری ہو جاتا اور خوبصورت آنکھوں سے طوفانِ اشک جاری۔

(۵)

آج ممتاز بیگم بیحد مسرور تھیں اور فرطِ مسرت سے تانبے کی طرح سرخ! وہ بیک وقت سب کام بھی نپٹا رہی تھیں اور تمام خواتین سے مبارکباد بھی وصول کر رہی تھیں۔

فرحت کے لبوں پر ایک معنی خیز مسکراہٹ رقصاں تھی

اُس نے ہنس ہنس کر اپنی پژمردہ بہن کو سنوارا، سکون قلب سے
ایک بہترین مستقبل کی دعائیں دیں اور اس سنجوگ پر اُس کی
تقدیر کو سراہتی رہی۔

رفعت عجیب چکر میں گرفتار تھی وہ اپنی بہن سے کچھ کہنا چاہتی
مگر فطری حیا زبان پر مہر لگا دیتی تاہم اسے بھی وہ بہنی برگشتگی طالع
سمجھتی کہ ایسی خیر اندیش آپا بھی، چھوٹی بہن کو اندھے کنوئیں میں دھکیلنے
کو تیار ہے مگر جبیں پر شکن نہیں اور نہ ہی تاسف کا اظہار ہے

اُس نے کئی بار معاملے کی تہہ تک پہنچنے کی کوشش
کی لیکن ہر بار نڈھال ہو کر رہ گئی۔ اک مہیب سا خوف تھا
جس سے اُس کا قلب لرزاں تھا اور روح ہراساں۔

تاہم کوئی مخفی قوت اسے چلا چلا کر رو لینے سے باز
رکھتی اور تا اختتام فیصلہ تقدیر زبان کو گنگ رکھنے پر اُکساتی۔

(٦)

اور وہ لمحہ بھی آ رہا تھا جس کا ممتاز بیگم اس شد و مد
سے انتظار کر رہی تھیں پھر وہ اک بہت بڑے فریضے سے فارغ
ہو جائینگی اور دن رات مولوی سعد الاسلام سے اسلامی مسائل سُنا
کرینگی ایسے دیندار انسان کی ساس بننا بھی اُنکی خوش قسمتی کی نشانی تھی

لیکن برات کے آنے کا وقت ہو چکا تھا۔ تاہم اس طرف سے کوئی نشان گہما گہمی کا نظر نہ آتا تھا۔ رسم عقد شام کے پانچ بجے مقرر کی گئی تھی اور اب دس منٹ اوپر بھی ہو چکے تھے پہلے تو ممتاز بیگم نے اس بات کو کچھ اہمیت نہ دی لیکن جب دس سے بیس منٹ اور اس کے بعد آدھ گھنٹہ بھی ہو گیا تو تمام خواتین میں سرگوشیاں ہونے لگیں اور یہ بھی کچھ مشتبہ سی ہو گئیں۔ مولوی صاحب کا ابتک کچھ پتا نہ تھا اور یہاں تمام محفل تیار تھی۔ ممتاز بیگم قریب قریب رونے لگیں انھیں اپنی بدنامی کا ڈر سب سے بڑھ کر تھا۔ کچھ خواتین واقعات کو بڑھا چڑھا کر ایک دوسری سے بیان کر رہی تھیں اور کچھ ان کی دلدہی میں مصروف تھیں کہ کیفی اک تار لئے ہوئے اندر داخل ہوئے۔ ممتاز بیگم نے دھڑکتے ہوئے دل سے اس کی بابت دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ مولوی صاحب کا ہے وہ اپنے ایک مرید احمد کریم کے ہاں ایک ضروری کام کی غرض سے گئے ہیں اور واپسی کم از کم ایک ہفتہ بعد ہوگی

ممتاز بیگم کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔ وہ اچھی طرح جانتی تھیں کہ پہلے اس مرید کی دختر کو مولوی صاحب عقد میں لانا چاہتے تھے لیکن لوگوں کی چہ میگوئیوں کے ڈر سے خاموش ہو گئے۔ اب

ایکاایکی اُن کا غائب ہوجانا بھی کسی ایسی ہی مصلحت پر مبنی تھا

(۷)

سینکڑوں لوگوں کے مجمع کو کس طرح منتشر کیا جاتا بعد میں نہ معلوم کیسی کیسی جھوٹی باتیں مشہور کی جاتیں۔ ممتاز بیگم کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اب کیا کیا جائے کیونکہ یہ تو ظاہر ہی تھا کہ اگر اسی وقت شادی نہ ہو سکی تو یہ بہت بھاری بے عزتی تھی جسے وہ دم واپسیں تک بھول نہیں سکتی تھیں۔

فرحت نے ڈرتے ڈرتے وصفی (کیفی کے برادر خورد) کا پھر سے ذکر کیا اگر کوئی اور موقع ہوتا تو ممتاز بیگم بیٹی کے پیچھے پڑ جاتیں کیونکہ وہ وصفی کے نام سے بیزار رہتی تھیں اور اُس کی آزاد خیالی سے متنفر!...... لیکن اب ندامت بھرے لہجے میں منظوری دی گئی اور رسم شادی بخیریت اختتام پذیر ہوئی۔ اگرچہ ممتاز بیگم کا دل بجھ گیا تھا لیکن وہ مطمئن تھیں کہ اب لوگ خواہ مخواہ باتیں تو نہیں بنائیں گے جو بصورت دیگر ممکن ہی نہیں بلکہ امر ضروری تھا رفعت کے زرد چہرے پر بھی اس خبر سے ہلکی ہلکی سرخی دوڑ رہی تھی اور فرحت کی مسرتوں کا تو ٹھکانا ہی نہ تھا وہ نجنت تھی اور پیشتر سے کہیں زیادہ مسرور! تاہم اس معمہ کا حل تا حال

پورا نہیں ہوا تھا۔

(۸)

"بیگم! تم کس قدر ہوشیار اور دوررس ہو۔ اس کا اندازہ تو مجھے کل ہی ہوا" دوسری صبح ناشتہ کی میز پر بیٹھی فرحت سے کہہ رہے تھے "ورنہ میں تو ناامید ہو چکا تھا اور رفعت غریب کے مستقبل سے مایوس (اور وصفی کی طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے) بیچارے وصفی کی بیچارگی اور بھی دل گرفتہ کر رہی تھی"

سامنے ہی رفعت بھی سر جھکائے بیٹھی تھی اس کی جبیں پر قطرات انفعال چمک رہے تھے مگر لبوں پر کلیوں کا سا تبسم کھیل رہا تھا اور چہرے سے طمانیت ظاہر تھی۔

"مجھے تو اس بات کے خیال سے ہنسی آ رہی ہے" فرحت جیلی کی پلیٹ اٹھاتے ہوئے بولی "کہ مولوی سعد صاحب پر جب یہ بھید کھلے گا کہ تار محض جعلی تھا تو وہ کس قدر سیخ پا ہوں گے اور اس تلخ تجربے سے دل شکستہ

"اور آپکی امّی جان بھی تو یہ سن کر ناخوش ہونگی کہ مولوی صاحب کی طرف سے کوئی تار ہی نہیں آیا بلکہ انھیں خود بہانے سے روانہ کیا گیا ہے" وصفی بھی گفتگو میں حصہ لیتے ہوئے بولا

"لیکن اس دھوکے کے بغیر کام بھی کیونکر ہو سکتا تھا ظاہر ہے کہ وہ کمبخت اس لالچ کے بغیر یہاں سے جانے کا نام ہی نہ لیتا" فرحت نے مسکرا کر جواب دیا

"اور ممکن ہے کہ وہ اپنی خفت مٹانے کے لئے اسی لڑکی سے چوتھی شادی کر لے جس سے پیشتر ہی کرنا چاہتا تھا" کیفی نے سنجیدگی سے جملہ ختم کیا۔

"بہر حال خس کم جہاں پاک" فرحت اطمینان کا سانس لے کر بولی "خدا کا شکر ہے۔ صد شکر! کہ یہ ہمارا لطیف سا دھوکا اس قدر کامیاب رہا۔ اب صرف امی جان کو منانا رہ گیا ہے سو وہ بھی کبھی نہ کبھی تو معاف کر ہی دینگی" (رفعت سے) پیاری بہن! مجھے معلوم تھا کہ تم قدرے بدگمان ہو چکی ہو اور میرے اس رویئے پر متعجب! لیکن یہ راز اگر اس وقت راز نہ رکھا جاتا تو اس کی اتنی قیمت نہ رہتی اور نہ ہی اس قدر منزلت ہوتی"

اور رفعت نے شکرگزاری کے طور پر بہن کے نازک ہاتھوں کو آنکھوں سے لگا لیا اور انھیں مسرت کے آنسوؤں سے بھگونے لگی۔

ٹھوکر

تمام دن کی مشقت سے چُور ستّار ابھی کام سے واپس
آیا ہی تھا کہ پریشان بیوی کو دروازے میں منتظر دیکھ کر اور بھی سہم
گیا۔ دھڑکتے ہوئے دل سے بچّی کی خبر پوچھی تو معلوم ہوا کہ آج
اُس کی حالت معمول سے کہیں زیادہ خراب ہے۔ ہمسائی کے لڑکے
کو دو دفعہ حکیم صاحب کے پاس بھیجا تھا لیکن وہ پہلے کے پیسے طلب
کرتے ہیں اور آئندہ کے لئے اُدھار دوا دینے سے منکر! ایک تو
تھکن اور کوفت! اُس پر مستزاد یہ خبر! ستّار کو جیسے کھڑے
کھڑے چکّر آ گیا ہو۔ وہ لڑکھڑاتے ہوئے قدموں سے اندر داخل
ہوا۔ ثریّا میلے کچیلے کپڑوں میں لپٹی ہوئی ٹوٹی سی چارپائی پر پڑی
تھی۔ چہرہ زرد زرد تھا اور لب خشک۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ایک
بے جان مجسّمہ سامنے پڑا ہے۔ باپ کے قدموں کی آہٹ سُن کر
اُس نے بمشکل تمام آنکھیں کھولیں اور اٹک اٹک کر کہا "ابّا
میری گڑیا"! آج ستّار کو کوئی بہانہ نہ مل سکا جس سے

کم از کم کچھ دیر کے لئے مریضہ کا دل بہل جاتا۔ ثریا کچھ دیر مایوس نگاہوں سے باپ کو تکتی رہی لیکن اُس کے سکوت کو نفی سمجھ کر اور بھی پژمردہ ہو گئی اور زور زور سے رونا شروع کر دیا
ستار کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا کرے۔ اپنی غربت کا تلخ احساس اور اکلوتی لڑکی کی بیماری اسے قریب قریب دیوانہ بنا چلی تھی وہ کچھ دیر اس طرح ساکت کھڑا رہا اس کے بعد ایک نظر ثریا کے چہرے پر ڈالی اور بغیر کچھ کہے سُنے باہر کو جانے لگا بیوی نے اس کے چہرے پر عزم راسخ کے آثار دیکھ کر کچھ پوچھنا چاہا مگر بے سود! وہ اس سے پہلے ہی جا چکا تھا۔
ثریا، ننھی سی حسین اور معصوم بچی! جسکی میٹھی میٹھی باتوں اور بھولپن کی وجہ سے تمام گاؤں والے اُسے پیار کرتے۔ ماں اپنی تاریک زندگی کا اُجالا قرار دیتی اور باپ قلب تپیدہ کا سکون۔ آج بیمار تھی اور خطرناک حد تک۔ اور اُسکی وجہ محض یہ ہوئی کہ گزشتہ دنوں بسنت کا میلہ اُسے راس نہ آیا۔ باپ کے ساتھ بازار کی سجاوٹ دیکھتے دیکھتے وہ ایک گڑیا لینے پر مچل گئی۔ اُسکے سامنے ہی پٹواری اور نمبردار کی لڑکیوں نے بھی کئی گڑیاں خریدی تھیں اور وہ یہ سمجھنے سے معذور تھی کہ اُس کا باپ بھی اُسے کیوں نہیں خرید دیتا۔

ستار نے لڑکی کی ڈبڈبائی ہوئی آنکھیں دیکھیں تو اُس کا دل بے قرار ہو گیا۔ اپنی قرۃ العین کے لئے جو کہ اُسے دولت کونین سے بڑھکر عزیز تھی۔ وہ کیا کچھ نہیں کرنا چاہتا تھا مگر گڑیا کی قیمت کے سوال نے اُس کی ہمت توڑ دی۔ چار روپے تو وہ چار ماہ میں بھی نہیں پیدا کر سکتا تھا۔

چیختی چلاتی لڑکی کو سینکڑوں بہلاوے دئیے مگر بے کار اسکی وہی گڑیا کی رٹ تھی اور باقی تمام چیزوں سے بے تعلقی۔ ناچار ستار اُسے گھر لے آیا اس وقت مسلسل روتے رہنے سے ثریا کی آنکھیں سُرخ ہو رہی تھیں اور بدن بھی قدرے گرم تھا بتمام رات وہ گڑیا کے لئے روتی رہی ستار اس کی حالت دیکھ دیکھ کر کڑھ رہا تھا اور ماں پروانہ وار نثار ہو رہی تھی لیکن ثریا کسی طرح چپنے ہی نہ پاتی۔ اُس کی نگاہوں میں تو گڑیا بسی ہوئی تھی سُرخ فراک میں ملبوس۔ گلابی رخساروں اور نیلی آنکھوں والی گڑیا۔ انتب بھر ہلکان ہونے کے بعد صبح کو اُس کا بخار تیز تر ہو چکا تھا لیکن آنکھوں میں طلب تھی اور لبوں پر شکوہ۔

اور نوبت بایں جا رسید کہ اس حالت میں پندرہ دن گزر گئے اور ثریا کی حالت روز بروز گرتی ہی جا رہی تھی۔ حکیم صاحب ایک

دو مرتبہ تو جبراً قہراً آکر دیکھ گئے مگر جب سمجھا کہ یہاں سے کچھ ملنے کی امید نہیں تو وہ بھی آنے سے کترانے لگے اگر کبھی ستار بلانے جاتا بھی تو وہ یونہی باتوں میں ٹال جاتے تاہم تشخیص یہ تھی کہ دماغ پر کوئی سخت صدمہ گزرنے سے یہ حالت ہو گئی ہے

ستار نے اپنی مزدوری کے اوقات بڑھا دئے تاکہ جلد از جلد چار روپیہ اکٹھا کر کے گڑیا خرید سکے مگر ادھر ثریا کی حالت بد سے بدتر ہو رہی تھی اور اُدھر وہ بہم جانفشانیوں پر بھی دو روپیہ سے زیادہ جمع نہ کر سکا۔

چنانچہ آج تو معصوم بچی کا یہ حال دیکھ کر اُس سے ضبط نہ ہو سکا دل میں تہیہ کر لیا تھا کہ اگر کہیں سے بھی اُدھار نہ مل سکا تو خواہ بھیک ہی کیوں نہ مانگنی پڑے مگر بچی کا مطالبہ کسی نہ کسی طرح ضرور پورا کیا جائیگا۔

لیکن آج کل تو بھیک مانگنا بھی جوئے شیر لانے سے کم نہیں یہ شاید وہ عالمِ غم و غصہ میں بھول چکا تھا چنانچہ جب اُدھار کے نام سے کوڑی بھی نہ ملی تو مریض بچی کی حالت کا اندازہ کرتے ہوئے وہ سر بازار ہاتھ پھیلانے پر کمربستہ ہو گیا

مفلس ہوتے ہوئے بھی وہ خوددار تھا اور غیور! اُس کا قلب اس احساس سے مجروح ہو رہا تھا اور روح خاکستر! مگر بچی کے لئے!!

آہ اپنی ننھی ثریا کے لئے وہ کیا کچھ کرنے کو تیار نہ تھا
اور بھیک مانگتے بھی آدھا دن گزر گیا لیکن گاؤں
کی مفلس آبادی بھلا اس کی کیا مدد کر سکتی تھی۔ لوگ نگاہِ ترحم سے
اس کی طرف دیکھتے اور خاموشی سے پاس سے گزر جاتے۔ ستار اپنی
ہستی سے بیزار ہو رہا تھا۔ اسقدر ذلت اور جد و جہد کا نتیجہ بھی صفر!
اور اب وہ زمیندار کے ہاں جانے کو تیار ہو گیا۔ وہی زمیندار جس نے
اس کے آسودہ حال باپ کو تباہ کر دیا تھا اور جسکی وجہ سے بیٹا بھی
مفلسی کے خونخوار پنجے میں گرفتار تھا۔ وہ زمیندار جسکے لئے مشہور تھا
کہ وہ دن رات اپنے دولت کے ڈھیر کی نگرانی کرتا رہتا ہے کسی
مہیب اور بھوکے اژدہے کی طرح! اور جبتک وہ اپنے انبار سیم و زر کو کئی
کئی بار شمار نہیں کر لیتا اسے کسی کل چین ہی نہیں پڑتا
ستار کو دزانہ آگے بڑھتے دیکھ کر زمیندار چونک اٹھا
ایک ذلیل انسان کی اتنی جرأت! اس قدر جسارت! وہ آنکھیں
ملنے لگا کہ یہ کہیں عالم خواب تو نہیں۔
"زمیندار صاحب! مجھے دو روپیوں کی ضرورت ہے
سخت ضرورت"! ستار لجاجت سے بولا" میری لڑکی بیمار
ہے۔ وہ رو رو کر اپنی جان دے دیگی"۔

"تو تمھاری لڑکی کی بیماری سے مجھے کیا تعلق" زمیندار نے چیں بہ جبیں ہو کر جواب دیا۔

"آپ صرف دو روپے دے دیجئے جو میرے پاس موجود ہیں وہ گڑ گڑیا کے لئے ہلکان ہو رہی ہے اس صورت میں اسکی گڑیا آ سے مل جائے گی اور وہ آپکے جان و مال کو دعا دے گی"

"چہ خوش" زمیندار نے ہنسکر کہا "رہنا جھونپڑوں میں اور خواب دیکھنے محلوں کے" اور پھر وہ اتنا ہنسا۔ اتنا ہنسا کہ اُس کی آنکھوں سے پانی جاری ہو گیا اور ستار حیران ہو کر سوچنے لگا کہ اس قدر ہنسی کی وجہ کیا ہو سکتی ہے

"تو سرکار! آپ کچھ نہیں دیں گے" وہ بعد از انتظار بولا "میں تو یہاں آس لگا کر آیا تھا!"

"بس بہت کھیل ہو چکا" زمیندار اب اپنی اصلیت پر آ چکا تھا "میرے پاس کسی کو دینے کے لئے فالتو پیسے نہیں ہیں"

"آپ یہ کیونکر کہہ سکتے ہیں" ستار کو بھی جوش آ رہا تھا ہمارے لہو کی آخری بوند نچوڑ کر بھی آپکے پاس کچھ نہیں۔ اگر یہ دولت کے انبار نہیں جنکی دن رات حفاظت ہو رہی ہے تو اور کیا ہے"

"گستاخ! بدزبان!! کمینہ!!!" زمیندار غصہ سے تھرا کر بولا

"اب زبان بند کرتا ہے یا دھکّے دے کر باہر نکالوں"

ستار لاکھ بیٹوا و مفلس سہی مگر وہ ان الفاظ کا عادی نہیں تھا شدّتِ غیرت سے وہ اپنے آپے میں نہ رہا اور آگے بڑھنے ہی کو تھا کہ زمیندار کے شکاری بوٹ کی ٹھوکر نے اُسے کئی قدم پیچھے دھکیل دیا۔

ستار سب کچھ برداشت کر سکتا تھا مگر یہ ٹھوکر! اُسکی آنکھوں میں خون اُتر آیا۔ اِدھر اُدھر نگاہ دوڑائی۔ سامنے ہی ایک ٹوٹی ہوئی کرسی پڑی تھی۔ جذبۂ انتقام سے بے خود ہو کر وہی کرسی زمیندار کی طرف دے ماری۔

یہ سب کچھ چشم زدن میں ہوا لیکن اتنی ہی دیر میں سینکڑوں لوگ جمع ہو چکے تھے۔ تھانیدار صاحب تفتیش کو تیار رکھتے اور کانسٹبل اُسے کشاں کشاں تھانے کی طرف لئے جا رہا تھا

زمیندار کو محض معمولی سی چوٹ آئی تھی۔ بے ضرر سی چوٹ! جس کے لئے نظامِ کائنات درہم برہم ہو رہا تھا اور اُسکی اور اس سے وابستہ زندگیاں برباد۔

وہ سوچ رہا تھا کہ اگر معمولی سی ضرب کی اس قدر قیمت ہے تو وہ ٹھوکر کیوں اہمیت نہیں رکھتی جس نے اُسکے

قلب کی گہرائیوں میں گھاؤ پیدا کر دیا تھا اور روح کو آمادہ بر
بغاوت۔ جس کا ثبوت اُس کی ایک ٹانگ کا بڑھتا ہوا ورم تھا
ادھر ستم رسیدہ بیوی۔ دم توڑتی بچی کو لئے اُس کی
منتظر تھی اور یہاں ستار سرمایہ داری کا مقابلہ کرنے کے جرم میں ماخوذ
تھا اور نہ معلوم کب تک کی سزا بھگتنے کا سزاوار

بعد از وقت

دم بھر بھی چین سے نہ بسر زندگی ہوئی
اُف! کیا ستم ہیں گردشِ لیل و نہار کے

پانچ سال کا ننھا شہیر آج بیس برس کا ہو گیا تھا۔ ستم رسیدہ اور بیوہ ماں پھولے نہیں سما رہی تھی۔ اپنی دنیائے آرزو کو سرسبز دیکھ کر وہ شاد شاد تھی اور حد سے بڑھ کر مسرور

مرحوم سلطان کوئی جائداد اپنے خورد سال بچے کے لئے چھوڑ کر نہیں مرا تھا اور نہ ہی اُس کی آمدنی اتنی زیادہ تھی کہ کچھ پس انداز ہو سکتا تاہم یہ نسرین کی ہمت تھی کہ اُس نے کبھی شہیر کو محسوس نہ ہونے دیا کہ باپ کے نہ ہونے سے کبھی خرچ میں بھی تنگی آسکتی ہے یا امی کو سینکڑوں بار اُٹھانے میں کتنی دقت کا سامنا کرنا پڑتا ہے

شوہر کے انتقال کے وقت نسرین بالکل نوعمر تھی چاہتی تو اُس کا مستقبل درخشاں ہو سکتا تھا اور آئندہ زندگی پُرسکون لیکن اُسے ننھے شہیر کا خیال تھا کہ اُس نے اپنی راحتیں اُس پر سے قربان کر دینا اپنا فرض اولین سمجھا اور ہر طرح کے مصائب کا مردانہ وار مقابلہ کر سکی

تیار ہوگئیں۔ شوہر مرحوم کی اس نشانی کو وہ اپنی آنکھوں میں بٹھاتی اور دل کی گہرائیوں میں جگہ دیئے ہوئے تھی اور یہ محض شہیر کے لئے ہی تھا کہ سلائی کرتے کرتے اُس کی انگلیوں میں چھید ہو گئے تھے اور بڑھاپے کا قبضہ قبل از وقت۔

مگر وہ مطمئن تھی اور اس خیال پر قانع کہ بچہ تو آرام سے تعلیم حاصل کر رہا ہے اور کوئی رکاوٹ اُسکے راستے میں حائل نہیں ہے

شہیر ایک ذہین اور ہوشیار لڑکا تھا وہ بتدریج تعلیمی مدارج طے کرتا رہا۔ قدرے ہوش آنے پر اسے اندازہ ہوا کہ ماں کو اُسکی پرورش میں کتنے مصائب سے دوچار ہونا پڑا ہے تو اُسکی عقیدت اور بھی بڑھ گئی اور گھنٹوں ان تفکرات میں غلطاں و پیچاں رہنے لگا کہ جلد از جلد کسی لائق بن سکے تاکہ ان تکالیف کا کچھ تو مداوا ہو سکے۔

اور آج شہیر ایک بست سالہ نوجوان تھا خوبصورت اور نیک سیرت جس پر ماں کو ناز تھا اور بجا فخر۔ وہ حیات گزشتہ کی تمام تلخیاں اُسے دیکھ کر بھول جاتی اور اپنی عمر بھر کی سعی کو بار آور ہوتے دیکھ کر شکر حق ادا کرتی

تعلیم سے فارغ ہو کر شہیر ایک اسکول کا مدرس بن گیا نسرین کے جیسے تمام تفکرات دھل گئے ہوں اُسے مسرت تھی کہ بیٹا

صحیح معنوں میں فرمانبردار اور سعادتمند ثابت ہو رہا ہے۔ خود شہیر
کی عادت تھی کہ تنخواہ کے تمام پیسے ماں کے ہاتھوں میں لا کر رکھ دیتا
مگر نسرین اس کے نام سے علٰحدہ جمع کرتی رہی یہاں تک کہ گھر کے
خرچ کے لئے بھی اُس میں سے خرچ کرنے کی روادار نہ تھی اور بقدر
فراغت ہونے پر بھی وہ آرام سے نہ بیٹھی کیونکہ اب وہ شہیر کے لئے
بیوی اور گھر کی لکشمی لانے کی فکر میں تھی اور اسی غرض سے پیسے
اکٹھے کرنے میں غلطاں۔

سلائی کرتے کرتے اُس کی بصارت ایک حد تک کمزور
ہو چکی تھی اور ہاتھوں میں رعشہ بھی شروع ہو گیا تھا لیکن شہیر کے
لئے ہر قسم کی تکلیف برداشت کرنا تو اس کی عادت ثانیہ بن چکی
تھی اس لئے اس امر کو بھی اہمیت ہی نہ دی۔

اگر شہیر کہتا بھی کہ " امی اتنا کچھ تو آپ میرے لئے
کر چکیں اب تو قدرے آرام کیجئے تا کہ میں ان بے لوث اور بغیر ستائش
خدمات کا کچھ تو حق ادا کر دوں "

تو نسرین ہنس کر جواب دیتی " بیٹا! اب میں تو اکیلی ہی آرام
کروں گی۔ تمہاری بیوی کے آنے کی دیر ہے۔ مکان اُسکے سپرد
کر دوں پھر مجھے کام ہی کیا رہ جائے گا۔ ایک کونے میں بیٹھی عبادت

کیا کروں گی"

"لیکن امی سچ پوچھئے تو میں اس امر کے بعید خلاف ہوں۔ اس شادی وغیرہ کے"

"چلو بیکار باتیں نہ بناؤ" نسرین قدرے خفگی سے کہتی "یہ خواب تو میں اس وقت سے دیکھ رہی تھی جب تم ہنوز بچے ہی تھے۔ اب خدا کے فضل و کرم سے اس کے پورے ہونے کے دن آئے تو تم اس طرح کے الفاظ منہ سے نکالتے ہو"

"لیکن میں ٹھیک کہتا ہوں امی جان! کیونکہ مجھے ڈر ہے کہ اس صورت میں آپ کو کوئی تکلیف نہ پہنچے"

"کیسی باتیں کرتے ہو شبیر! مجھے تکلیف تو در کنار۔ مسرت روحانی ہو گی اور سرور قلبی"

"وہ تو میں بھی جانتا ہوں امی! لیکن بعض اوقات خیال ہوتا ہے کہ اس آنے والی ہستی کی وجہ سے گھر کی فضا مکدر نہ ہو جائے میرے تمام دوستوں کو اس کا تلخ تجربہ ہو چکا ہے"

"لیکن گھر کی لکشمی لا کر اسے شکایت کا موقع ہی کیوں دیا جائے اور برا سلوک کرنا چہ معنی دارد۔ بیٹی تو اپنی بہو کو حقیقی بیٹیوں سے بڑھ کر سمجھونگی۔ اپنے قلب کی گہرائیوں میں جگہ دونگی"

لیکن شہیر ان دلائل سے لاجواب نہ ہوتا اور فرداً فرداً ان
تمام دوستوں کے حالات بیان کرنے لگتا جن پر ایسے واقعات گزر چکے
تھے تا وقتیکہ نسرین یہ کہہ کر اُسے خاموش نہ کر دیتی کہ "میری آخری خواہش
یہی ہے اور بہرصورت تمھیں پوری کرنا ہی ہوگی"

اور یہ آرزو آخر پوری کی ہی گئی اور بڑی شان و شوکت سے
نسرین نے غریب ہوتے ہوئے بھی دل کھول کر روپیہ خرچ کیا تا کہ
کسی کو یہ کہنے کا موقع نہ مل سکے کہ شہیر کی یتیمی رسم شادی کو فراغت
سے ادا کرنے میں مانع ہوئی ہوگی۔

لیکن اس کی بدقسمتی کہ اس سلسلے میں زیادہ چھان بین نہ
کر سکی اور محض حسنِ ظاہری دیکھ کر ہی تسلی کر لی۔ اور رضیہ تھی کہ اسکے
اکھڑ۔ بد دماغ اور مغرور ہونے میں کسی کو کلام ہی نہ تھا ہر ایک کو اپنے
سے کمتر سمجھتی اور بات بات میں سب سے اُلجھنے کو کمربستہ

لیکن نسرین نے سوچا کہ آہستہ آہستہ آخر راہ راست پر
آ ہی جائے گی اور جب تک میں خود گھر کے کام سنبھال سکتی ہوں اسے
تکلیف دینے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ وہ ہر وقت بہو کی
ناز برداریوں میں مصروف رہنے لگی۔ اُسے ہر طرح کا آرام دینا اپنا
فرض اولین سمجھتی اور اُس کی معمولی سی بھی خواہش کو پورا کرنے میں

مسرت قلبی محسوس کرتی

اور ادھر رضیہ تھی کہ ساس کو اپنی راہ میں کانٹا سمجھے ہوئے تھی یہ اس تربیت کا اثر تھا جو اس نے اپنی شفیق والدہ سے حاصل کی تھی۔ اس میں شک نہیں کہ یہاں اُسے ہر طرح کی آزادی حاصل تھی اور اس کے کاموں میں دخل اندازی نسرین کے نزدیک گناہ کبیرہ سے کم نہ تھی لیکن آخر وہ تو ساس ہی تھی اور یہی وجہ رضیہ کی نفرت کی بھی تھی۔ اس نے اشارتاً شہیر سے علیحدگی کا ذکر کیا لیکن اس سے نفی میں جواب سُن کر خاموش ہوگئی کہ جس ماں نے اس قدر تکالیف اور مصائب سے اُسے پرورش کیا ہے اسے بڑھاپے میں رنج پہنچانا اُس کی قدرت سے باہر ہے وہ کبھی اور کسی صورت میں بھی یہ گوارا نہیں کرے گا'

رضیہ نے ہر ممکن حربہ استعمال کیا مگر بے سود شہیر اُسے وارفتگی کی حد تک چاہتا مگر ماں کے احترام میں بھی کچھ کمی نہ رکھتا تاہم تابہ کے۔ رضیہ شاید تہیہ کئے بیٹھی تھی کہ یا تو وہی اُس مکان میں رہے گی یا شہیر اپنی ماں کو ہی رکھے۔

نسرین غریب بہو کے رویئے پر سخت حیران تھی اور اُس کی عادات پر متعجب۔ انتہائی لاڈ پیار پر بھی رضیہ کی یہ حالت تھی کہ

آسماں بدلا زمیں بدلی نہ بدلی خوئے دوست

تو اب کس طرح اسے خوش رکھا جاسکتا تھا اگر شہیر کا خیال نہ ہوتا تو وہ مکان تک چھوڑنے کو تیار تھی لیکن اکلوتے فرزند سے علیحدگی کا تصور سدّ راہ تھا اور بیچارہ شہیر بھی تو بیحد پریشان تھا تمام دن دفتر سے میں بڈھا پڑھا کر گھر واپس آتا تو یہاں بھی دماغی سکون سے محروم ہی رہتا اور طمانیت قلبی کا خواہاں! رضیہ کوئی نہ کوئی مورچہ قائم کئے پڑی رہتی سو سو جتن کرکے اسے کھانا کھانے پر راضی کرتا۔ وجہ خاموشی دریافت کرتا تو سینکڑوں سوالوں کا ایک جواب ملتا اور وہ یہ کہ ہمیں علیحدہ رکھو ورنہ ماں باپ کے گھر بھیج دو"۔

نسرین نے کئی بار کہا بھی کہ اگر رضیہ کی خوشی اسی میں ہے تو مجھے بھی کوئی عذر نہیں شہیر اپنی بیوی کو لے کر علیحدہ ہوسکتا ہے لیکن وہ جانتا تھا کہ رضیہ کا جمع خرچ محض زبانی ہے علیحدہ رہ کر دو روز بھی گھر نہیں چلا سکے گی۔ علاوہ بریں مہربان ماں سے جدائی بھی اسکے لئے شاق تھی اس لئے بات ہی ٹال جاتا۔

لیکن ایک روز تو معاملہ حد سے زیادہ بڑھ گیا۔ اور بات صرف اتنی تھی کہ نسرین کی ملنے والی چند خواتین آئیں تو انھوں نے بہو کو بھی دیکھنا چاہا نسرین کو کیا علم تھا کہ نوبت یہاں تک پہنچ جائے گی۔ وہ رضیہ کو بلانے اوپر گئی دیکھا کہ سونے کا بہانہ کئے پڑی ہے۔ ڈرتے ڈرتے کہا کہ کچھ خواتین ملنے کی

منتظر ہیں تو فوراً جواب دے دیا کہ مجھے نیچے اُترنے کی فرصت نہیں نسرین نے بہتیری خوشامد کی۔ التجائیں کیں مگر بیکار محض! پتھر دل تھا کہ پسیجنے میں نہ آتا تھا۔ صاف کہہ دیا کہ کسی کی زبردستی تو نہیں کہ سوتے سوتے اُٹھ کر پیشوائی کو حاضر ہوں۔ نسرین کو اس جواب کی اُمید نہ تھی۔ غم و غصہ سے اسکی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور باوجود ضبط کے بھی یہ الفاظ نکل ہی گئے "بلیٹی! میری غلطی تھی کہ تمھاری عادت سے واقف ہوتے ہوئے بھی بُلانے چلی آئی لیکن اب تو معاف کردو اور ذرا دیر کے لئے تو نیچے چلو"

رضیہ اور بھی بگڑ گئی کہ یہ باتیں اسے طنزاً کہی گئی ہیں سینکڑوں صلواتیں ماں باپ کو دی گئیں جنھوں نے اس مصیبت میں پھنسا دیا تھا اسکے بعد شہیر کی باری آئی کہ اسے میری ذرہ بھر بھی پروا نہیں اور نسرین بھی اس لپیٹ میں آئے بغیر نہ رہ سکی۔

بات رفت و گزشت ہو جاتی اگر روز روز کر اسے شہیر کے آگے نہ دُہرایا جاتا۔ رضیہ فوراً میکے جانے پر مصر تھی اور تاوقتیکہ نسرین سے پیچھا نہ چھڑایا جائے واپس آنے سے منکر۔ اور غریب نسرین کی تو یہ حالت تھی بات بھی کھوئی الجھا کرچکے

بیٹے کی پریشانی سے اُس کا قلب متزلزل ہو رہا تھا۔ اس سے جدا ہونے کا خیال تک چونکا دیتا لیکن وہ غیور ہونے کے ساتھ ساتھ عقلمند بھی تھی۔

جانتی تھی کہ یہ ہر وقت کی اُلجھنیں شہیر کی صحت پر ناخوشگوار اثر ڈال رہی ہیں اور گوناگوں تفکرات اُسے کہیں کا بھی نہ رکھیں گے۔

اس لئے خود ہی اپنے آبائی گاؤں کو جانے پر تیار ہو گئی۔ شہیر ماں سے جُدا ہونا نہیں چاہتا تھا لیکن اس کے بغیر چارہ بھی نہ تھا۔ اُسنے بہتیرا کہا کہ کیوں نہ رضیہ کو بھی اُس کے ماں باپ کے پاس بھیجدیا جائے لیکن نسرین کو یہ بات مناسب نہ معلوم ہوئی

روانگی کے وقت دونوں ماں بیٹوں کی حالت غیر تھی اور نسرین کے آنسو تو کسی طرح تھمتے ہی نہ تھے تاہم یہ وقت بھی کسی نہ کسی طرح گزر ہی گیا اور مکان کی فضا سکون پذیر ہونے پر لوٹ آنے کے وعدے پر وہ بادلِ ناخواستہ فرزند سے رخصت ہوئی۔

شہیر گھر کی حالت کا اندازہ کر کے اور بھی رنجیدہ تھا۔ رہی چہار طرف بے اطمینانی کا دور دورہ تھا اور بڑھتی ہوئی اُلجھنوں کا حصار

وہی مکان جہاں نسرین کے وقت میں ہر چیز وقت پر دستیاب ہو جاتی اور کھانے کا انتظار نہیں کرنا پڑتا تھا۔ اب معمولی سی چیز تلاش کرنے میں گھنٹے لگ جاتے اور گھر میں کھانے کا کوئی انتظام نہ دیکھ کر ہوٹل سے لانا مقرر کیا گیا۔ اسی پر بس نہیں بدمزاج رضیہ کے ہر وقت کے طعن و تشنیع سب سے بڑھکر تھے۔

ادھر نسرین زندگی کے دن نہ معلوم کس طرح پورے کر رہی تھی۔ اپنے مرکزِ امید سے علیحدگی اور وہ بھی نہ معلوم کتنے عرصے کے لئے ایک ایسا صدمہ تھا کہ اُسے گھن کی طرح کھائے جا رہا تھا۔ اور چند ہی روز میں گھل گھل کر وہ آدھی رہ گئی تھی۔ آج تک تو اس آرزو میں دن بیت رہے تھے کہ شہیر کی کامیاب زندگی اُس کے بھی تمام دکھوں کا خاتمہ کر دے گی لیکن اب تو یہ حال تھا کہ

یہ طاقت بھی جانِ حزیں ہو چکی

اس کی ناتواں ہستی تھی اور آرزوئے موت۔ شہیر کو خطوط وہ باقاعدہ لکھتی لیکن اپنی صحت کی بابت کبھی تحریر نہ کیا۔ جانتی تھی کہ پہلے ہی الم رسیدہ ہے اس خبر سے اور بھی پریشان ہوگا اور اب تو محض اک چراغ سحری تھا کہ صرف ایک جھونکے سے ہی گل ہوا چاہتا تھا

حالات بد سے بدتر ہوتے رہے شہیر کو طمانیت ماں کی شفقت بھری آغوش میں ہی نظر آئی اُس نے رضیہ سے صاف کہہ دیا کہ اگر میکے جانا چاہے تو جا سکتی ہے وہ بھی اپنی ماں کے پاس چلا جائے گا رضیہ تو گویا اس موقع کی منتظر ہی تھی اور جانے پر اُدھار کھائے بیٹھی تھی کیونکہ اُس نے دیکھ لیا تھا کہ یہ نسرین ہی تھی جس نے کبھی محسوس ہی نہ ہونے دیا کہ گرھستی کے کام اس قدر مشکل ہوتے ہیں

تاہم وہ اپنا قصور ماننے کو تیار نہ تھی اور اگر پشیمان بھی ہوتی تو یہ
بعد از وقت تھا کیونکہ فرزند سے علیحدہ اور فرقت زدہ نسرین تو
چراغِ سحری تھی اور بجھنے کے قریب نیز اس لمحے کی منتظر جب فرشتہ اجل
کا لمس تمام مصائب کا خاتمہ کر دے گا۔

شہیر فوراً گاؤں روانہ ہو گیا۔ اُس کی روح شاد شاد تھی
اور قلب مسرور، سوچتا تھا کہ ماں اُس کی اچانک آمد سے حیران
رہ جائے گی اور یہ سن کر تو نسرین کو اور بھی مسرت ہو گی کہ شہیر اب
کبھی اُسے اکیلا نہ چھوڑے گا کیونکہ وہ رضیہ سے جدا ہو کر وقت گزار
سکتا ہے مگر امی سے تو ذرا سی دیر کی علیحدگی بھی ناگوار گزرتی ہے

لیکن افسوس کہ اس کی آمد بعد از وقت ثابت ہوئی اور
بالکل بے کار! کیونکہ مظلوم نسرین دہر کی چیرہ دستیوں کی اس سے
زیادہ تاب نہ لا سکتی تھی اس لئے وہ اسے خیرباد کہہ چکی تھی اور اپنے
فرزند تک کا انتظار کرتے کرتے یہاں کی قیود سے آزاد اور وہ
بھی شہیر کے پہنچنے سے صرف دو گھنٹے پیشتر۔

اُس کے چہرے پر سکون تھا اور لبوں پر لازوال
تبسم، جیسے زبانِ حال سے کہہ رہی ہو کہ میں صرف تمہاری منتظر
رہی۔ اب مطمئن ہوں قطعی بے فکر! اور قدرت کی ستم ظریفیاں

سے بے نیاز۔

اور شہیر سر جھکائے افسردہ و ساکت کھڑا تھا اُس کی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز تھیں اور قلب رنج سے بھرپور شاید اسوچ رہا تھا کہ کچھ عرصہ پیشتر کیوں نہ پہنچ سکا۔
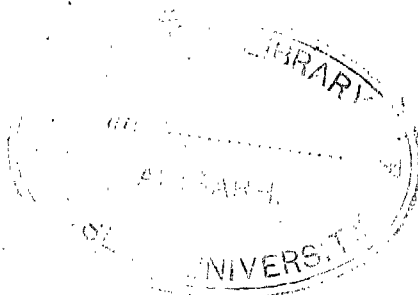
قید کی وجہ

افسردہ ہوئے ہیں پھول سارے — جو سرخ تھے زرد ہو گئے ہیں
بلبل کے وہ چہچہے کہاں اب — نغمے ہمہ تن درد ہو گئے ہیں
اس بزم میں ہی نہیں ہے گرمی — یا ہم ہی الٰہی سرد ہو گئے ہیں؟

سرما کی وہ سرد و تاریک رات! کائنات آہوں میں لپٹی ہوئی تھی اور فضا نمناک! تند ہوائیں بھوت اپنے بھیانک راگ گاتے جا رہے تھے اور آسمان پر ابر سیاہ کے ٹکڑے چھائے ہوئے تھے سرد جھونکے درختوں کی پتیوں سے اُلجھ اُلجھ کر آہ و بکا کرتے اور کچھ اس انداز سے کہ کپکپاتی ہوئی روح قالب میں اور بھی سہمی جاتی تھی۔ مجبور ہو کر میں نے قلم ہاتھ سے رکھ دیا۔ اللہ! آج تو اپنے محبوب مشغلے یعنی مضمون نگاری سے بھی وحشت ہو رہی تھی بابا فوزی آتشدان میں کوئلے ڈالنے کے لئے آیا تو میں خاموشی سے تنگ آ کر دریچہ سے باہر دیکھ رہی تھی
"خاتون راز! کھڑکی بند کر دیجئے" وہ مجھے مخاطب کر کے

کہنے لگا۔" الامان! آپ سردی سے اس قدر کانپ رہی ہیں مگر ہوا کے رخ سے ہٹتی نہیں"

"بابا فوزی میں سکوت سے گھبرا رہی ہوں میں نے جواباً کہا ذرا اسی لئے یہاں آکر کھڑی ہو گئی تھی۔ اب تم کوئی بات سناؤ تو قدرے وقت کٹے"

"کیسی بات خاتون راز! مجھ خانماں برباد اور غریب الوطن کی باتوں میں بھلا آپ کو کیا دلچسپی ہو سکتی ہے"

"میں زندگی کے ہر تاریک پہلو کا بہ نظر غائر مطالعہ کرنے کی عادی ہوں بابا فوزی! یاد تو بخیر! تم نے اس روز اپنی زندگی کے واقعات سنانے کا وعدہ کیا تھا۔ اس لئے کیوں نہ وہی قصہ سناؤ"

"آپ اس ہوشربا داستان کے سننے کی تاب بھی لا سکینگی"

بابا فوزی آہ سرد ہو کر بولا

"بہر صورت میں سنونگی ضرور" میں نے کسی قدر اصرار سے کہا

بابا فوزی مجبور ہو گیا اور قدرے سکوت کے بعد یوں گویا ہوا "میں اب تک یہی سمجھتا تھا کہ تم جسکو سنا سکوں وہ میری داستان نہیں اور اسی لئے آپ کے سوال کو ایک دو بار یونہی ٹال دیا لیکن اب اس اصرار پر میرا انکار غالب نہ آسکے گا اس لئے اپنے دلِ غمدیدہ کا بار آپ کو

شریک داستان بنا کر ہلکا کروں گا۔ اور ضرور ضرور، اگر پہلے یہ تو
بتائیے خاتون راز! کہ اس امر کا آپ کو کچھ اندازہ ہو سکتا ہے کہ
یہاں آنے سے پیشتر یہ کہاں تھا اور کس حالت میں"؟

"بھلا میں یہ کیوں کر جان سکتی ہوں" میں نے متحیر ہو کر
جواب دیا اور بابا فوزی کے چہرے کی طرف تکنے لگی۔

اسے ہمارے ہاں آئے محض دو ماہ ہوئے تھے اور وہ بھی
ایک واقفکار کی سفارش پر کہ آدمی محنتی اور ایماندار ہے۔ پوری
توجہ سے کام کرے گا بابا فوزی کی ظاہری حالت صاف بتا رہی تھی کہ

ستم دہر کا مارا ہوا [illegible] ہے

اسی لئے زیادہ پوچھ گچھ بھی مناسب [illegible] گئی اور اتنے قلیل عرصہ میں
ہی ہم لوگ اسکی خوبیوں کے قائل ہو [illegible] اور گھر کا ہی ایک رکن سمجھتے
تھے تاہم یہ سوچ کر مجھے بے حد حیرت [illegible] طور پر! کہ وہ نہ معلوم کون
سے راز کا انکشاف کرنے لگا ہے اور [illegible] کہہ سکتا ہے کہ وہ پہلے
کہاں تھا اور کس حالت میں۔

چنانچہ بابا فوزی نے [illegible] تشویش دیکھ کر بولا "یہ امر حیران
کن سہی مگر میں اکٹھی چودہ سال کی قید کاٹ کر آ رہا ہوں تنہائی کی
سنگین اور قریب المرگ کر دینے والی اشتقت قید۔

"مگر یہ سب کیونکر ہوا بابا فوزی! آخر اس قید جانسوز کی وجہ؟" میری حیرت لمحہ بلمحہ بڑھ رہی تھی۔

"یہ سب کیونکر ہوا" یہ الفاظ دہراتے وقت بابا فوزی کے چہرے پر حقارت کے آثار نمودار تھے۔ "اس لئے کہ میں نے مفلس ہوتے ہوئے بھی سرمایہ داری کا مقابلہ کرنا چاہا اگرچہ اس میں ناکامیاب ہی رہا مگر آتش انتقام کچھ تو بجھ گئی اور ایک بینوا ہستی کے لئے این ہم غنیمت است۔ مگر میں کیوں نہ آپ کو شروع سے واقعات سناؤں"۔

اور بابا فوزی نے اس طرح اپنی الم ناک داستان شروع کی "ایک زمانہ تھا کہ ہم لوگ اپنے گاؤں والوں میں سب سے زیادہ خوشحال سمجھے جاتے تھے۔ محنت اور دیانتداری سے جس قدر اپنے کھیتوں سے حاصل ہوتا وہ ہماری ضروریات زندگی کے لئے کافی سے زیادہ تھا اور زندگی کے دن اطمینان سے گزر جاتے مگر کسی نے سچ کہا ہے مہ یکساں کبھی کسی کی نہ گزری زمانے میں ہماری شامت اعمال نے بھی ایک سال قحط سالی کی صورت اختیار کر لی۔ تمام تیار فصلیں تباہ و برباد ہو گئیں اور سینکڑوں انسانی ہوئی آرزو دیں پشیمندۂ کرم باراں! مگر اندر دیوتا کو رحم نہ آنا تھا

اور نہ ہی آیا۔ جب بیچارے مویشی بھی بھوک سے مرنے لگے تو ناچار میرے
سادہ لوح باپ نے زمیندار سے سو روپے اُدھار مانگے۔ وعدہ تھا کہ
کہ مع بیس روپیہ سود کے دو ماہ کے اندر اندر قرض اُتار دیا جائے گا
وقت گزرتا گیا اور لگان میں تخفیف ہو جانے کی وجہ سے ہمارا
کھیت بھی سلامت رہا۔ یہ خیال غالب تھا کہ اگلی مرتبہ تو یقیناً فصل
زرخیز ہوگی ہی یہ تمام تفکرات اُس وقت دور ہو جائیں گے زمیندار
کے پیسے بھی گھر کے برتن فروخت کر کے ادا ہو چکے تھے۔ قحط کے دنوں
میں کثرت مشقت کی وجہ سے والد کی صحت گر چکی تھی اس لئے ہنوز
فصل کے تیار ہونے میں کچھ عرصہ ہی تھا کہ وہ دہر اور اسکی تلخیوں کو
خیرباد کہہ گیا۔ مجھے رنج تو بیحد ہوا مگر حیات کی ناپائیداری کا اندازہ
لگا لیتے ہوئے آخر صبر آگیا اور کھیت کی رکھوالی میں وقت گزارنے
لگا۔ اس وقت بیوی، تین بچوں اور ضعیف ماں کی پرورش میرے
ذمہ تھی اس لئے ضرورت سے زیادہ مشقت کرتا تاکہ بعد میں کسی قسم
کی تکلیف نہ اُٹھانی پڑے۔ ایک روز کا ذکر ہے کہ صبح صادق کا وقت
تھا۔ درختوں پر چڑیاں، حمد و ثنا میں اور مساجد میں نیک
بندے مصروف عبادت! کہ میں اپنے کھیت کی طرف روانہ ہوا
آج میری روح فرط مسرت سے رقص کر رہی تھی اور قلب بڑھتی ہوئی

خوشیوں سے بلیوں اچھل رہا تھا اور وہ اس لئے کہ سرسبز و شاداب گیہوں کا کھیت کٹنے کو تھا اور میری ہمتیں تکمیل کو پہنچنے کی مشتاق۔

ہوا میں لہلہاتی ہوئی بالیوں کو دیکھ دیکھ کر شاد ہو رہا تھا کہ زمیندار نہ معلوم کہاں سے نمودار ہو گیا اس کے کارندے اور حواری بھی ساتھ تھے۔ میں نے سلام کر کے بیوقت اور بلا وجہ آنے کی وجہ پوچھی تو اس نے جواب میں کھانا آگے کر دیا۔ یا مظہر العجائب اس معمہ کو حل کرنے سے میں قاصر تھا اس لئے مجھے بتایا گیا کہ والد کا لیا ہوا سو روپیہ مع سود در سود کے پانسو ہو چکا ہے جو کہ فوراً ادا کیا جائے ورنہ بصورت عدم ادائگی کھیت ضبط کر لیا جائیگا"

کاٹو تو میرے بدن میں لہو نہیں تھا۔ سخت حیران تھا اور ساکت! اچھی طرح جانتا تھا کہ جعلسازی اور دھوکے سے کام لیا گیا ہے مگر کوئی ثبوت پیش کرنے سے عاجز تھا۔ والد روپیہ تو ادا کر چکے تھے مگر زمیندار کی باتوں میں آکر اس کی رسید نہ لے سکے اور اس کا نتیجہ ظاہر تھا۔ بہتیری منت و خوشامد کی۔ خدا و رسول کے واسطے دیئے اور کھیت سے محروم ہو جانے پر اپنے بچوں کی حالت زار کا نقشہ کھینچا مگر بے سود۔ اب یہ وہ نشہ نہیں جسے ترشی اتار سکے

کے مصداق زمیندار ٹس سے مس نہ ہوا۔

کھیت ضبط ہو گیا اور بسا بسایا گھر ویران۔ میں ہر ممکن کوشش پر بھی تو کہیں کام نہ ڈھونڈ سکا۔ اِدھر بیوی بچے بھوکے مر رہے تھے اور مرے پر سُو دُرّے۔ گاؤں میں ایکا ایکی ہیضہ پھوٹ پڑا میری بیوی اور تمام بچے ایک ساتھ اُسکی لپیٹ میں آ گئے۔ ویدجی موجود تھے مگر وہ تو وہیں جاتے جہاں سے جیب گرم ہونے کی اُمید ہوتی اس لئے ان کی خوشامد کرنا بیکار تھا اور سعی ناکام محض۔

مجھے اچھی طرح معلوم تھا کہ اس قدر مصائب کی وجہ محض زمیندار کی ذات ہے اور میری تباہی کا سبب اُسکی ظالم و جابر ہستی! جو اطمینان سے اپنے آرام دہ مکان میں لطفِ حیات اُٹھا رہا ہے اور اپنی تعدی کی شکار روحوں پر خندہ زن! مگر آہ! میں مجبور تھا اور بدلہ لینے سے معذور

اور یکے بعد دیگرے میرے دو بچے داغ مفارقت دے گئے باقی دو کی حالت بھی نازک تھی بھوکا رہ کر میں خاموش تھا اور کھیت کے چھن جانے پر ساکت مگر اپنے جگر گوشوں سے دائمی علیحدگی ایسی نہ تھی کہ وہ حالتِ جمود اسی طرح قائم رہتی۔ میرے ناتوان بازوؤں میں نہ معلوم کہاں سے قوت آ گئی اور مادۂ بغاوت۔ ناتوان روح میں توانائی۔ پاؤں خود بخود زمیندار کے مکان کی طرف اُٹھ رہے

تھے اور کوئی مخفی طاقت جذبۂ انتقام کو لمحہ بہ لمحہ تیز تر کر رہی تھی

اپنے قیمتی اور آرام دہ بستر پر زمیندار میٹھی نیند سو رہا تھا
اُس کے لبوں پر اک حقارت آمیز تبسم تھا اور چہرے پر رقص کرتی ہوئی
مسرت! جیسے خواب میں بھی کسی بے کس ہستی کو تباہ و برباد کر رہا ہو اور اپنے
کارہائے نمایاں پر مسرور ہو اور شاد و شاد!! اس دشمنِ جان اور قاتلِ
فرزندان کو دیکھ کر میری آنکھوں میں خون اُتر آیا۔ ہاتھ میں ہل ٹھیک
کرنے کا آلہ پکڑا ہوا تھا۔ اپنی ہستی سے بے پروا ہو کر اسی سے حملہ کر دیا۔ مگر
فاقہ زدہ جان میں اس قدر طاقت کہاں۔ میرا وار اوچھا پڑا۔ زمیندار
فوراً جاگ گیا۔ اُس کی چیخ پکار پر تمام لوگ جمع ہو گئے اور مجھے
سپردِ حوالات کر دیا گیا۔

زمیندار کا بیان تھا کہ میں اس کا مقروض ہوں ادا نہ کرنے کے
لئے دو مرتبہ پیشتر بھی اُس پر قاتلانہ حملہ کیا تھا مگر وہ بال بال بچ گیا
اور اب یہ کوشش تیسری مرتبہ ہوئی تھی۔ سعیِ قتلِ عمد میں مجھے
چودہ سال کی سنگین سزا ملی۔ اس میں زمیندار کا رسوخ اور رشوت
دونوں کام کر رہے تھے اور غربت پر سرمایہ داری کی مہرِ فوقیت بھی
ثبت ہوئی تھی۔ بیوی اور آخری بچے کی موت کی خبر مجھے جیل میں ہی مل چکی تھی
اب زندگی میں کوئی دلچسپی ہی نہ رہی بڑھاپے کا فوری غلبہ تھا اور میری

خزاں رسیدہ ہستی۔ آرزو تھی کہ بقیہ حصۂ زیست بھی گوشۂ کحولات میں ہی گزار دونگا مگر تقدیر کو یہ بھی منظور نہ ہوا اور کچھ عرصہ اِدھر اُدھر کی ٹھوکریں کھا کر آخر آپ کے ہاں پہنچا ہوں۔ بیگانہ از دہر ہوتے ہوئے بھی یہ خیال مجھے گھنٹوں ملول رکھتا ہے کہ جب بہترین ایام حیات جیل ہی کی نذر ہو نے تھے تو کیوں نہ میں زمیندار کے ناپاک وجود سے گاؤں والوں کو آزاد کر اسکا تاکہ انسانیت میری تشکر گزار ہوتی اور غربت زیر بار احسان۔ میرے عزیز بچوں کی روحوں کو سکون نصیب ہوتا اور میرے قلب طپیدہ کو اطمینان

ہچکیاں لے لے کر بابا فوزی نے اپنی داستان پوری کی میری کرسی کی گہرائیوں میں جیسے اداسی جاذب ہو کر رہ گئی ہو یا کوئی شُہانا خواب کسی کے دست تعدی نے جھنجھوڑ کر رکھ دیا ہو۔ دل اور بھی افسردہ ہو رہا تھا اور دماغ پر غلبۂ یاس و الم — فضائے آسمان پر سیاہ بادلوں کی فوجیں اُمنڈ رہی تھیں اک خون آلود سیاہی مسلط تھی کائنات تھی اور سرد جھونکوں سے درختوں کے پتوں میں ایک غم آگین ارتعاش ہو رہا تھا۔ بابا فوزی کی ناتوانی بے بسی۔ درماندگی اور افلاس مجھے متاثر کر رہا تھا مگر اس حد تک نہیں جتنا کہ اس احساس نے پریشان کر دیا تھا کہ کیا جذبۂ انتقام کو اتنا حق بھی حاصل نہیں کہ وہ اپنی ہستی کو نیستی کی حد تک پہنچا دیے جانے کا سبب دریافت کرے؟ اگر جواب اثبات میں ہے تو اس طویل اور سنگین قید کی وجہ؟؟

زندگی کی وہ ناقابلِ فراموش شام! آفتاب دھیرے دھیرے قدم اٹھاتا ہوا جا رہا تھا۔ ہلکی ہلکی ہوا چنار اور صنوبر کے درختوں میں سنسنا رہی تھی اور فضا میں آبشاروں کے سُریلے نغمے بکھر رہے تھے۔

میں اک عالمِ محویت میں امیرا کدل دریائے جہلم (کشمیر) کا پہلا برج پر کھڑی تھی اور مصروفِ مطالعۂ بوقلمونیٔ فطرت۔ سامنے ہی سفید سفید بادبانوں والی کشتیاں موجوں کے سینے پر تیر رہی تھیں جیسے سیکڑوں حسین جل پریاں مصروفِ گلگشت ہوں اور الوداعی کرنیں نیلے نیلے پانی کو اپنے رنگ میں رنگ رہی تھیں۔

شام کی سرخ روشنی میں جہلم زریں خوابوں کے دیکھنے میں محو تھا اور میں بےخبر از دنیا و مافیہا جیسے اس مادی دہر سے کچھ تعلق ہی نہ ہو کہ اچانک سامنے والی بوٹ میں ڈاکٹر صاحب کو جاتے دیکھ کر چونک اٹھی جیسے کوئی بھولی بسری بات یاد آ گئی ہو۔ اب مجھے اپنی بڑھتی ہوئی محویت پر تاسف ہو رہا تھا اور ایک مریض سے تغافل [illegible]

عینی سے میری ملاقات کشمیر کی حسین وادی میں ہی ہوئی تھی
اُن کا مختصر سا کنبہ مشتمل بر چند افراد تھا یعنی اُن کے علاوہ اُنکی ضعیف العمر
خالہ صاحبہ تھیں اور چند ملازمین۔

علینی اُن خاص لڑکیوں میں سے تھیں جنھیں ایک بار دیکھکر بھولنا
ناممکن سی بات ہو جاتی ہے اُنکے اطوار پسندیدہ تھے اور عادات قابل ستائش!
اُنکی پاکیزہ صورت اور نیک سیرت کے سوا جس چیز نے مجھے ایک حد تک متاثر
کیا وہ ان کی بلند خیالی تھی اور علم دوستی و بیدار مغزی لیکن افسوس کہ
ان صفات سے مزین ہونے کے باوجود وہ ستم رسیدہ تھیں اور ستم ظریفیٔ فطرت
کے ہاتھوں نالاں! اُنکی زندگی پُر از حسرت و یاس تھی اور ایام حیات تلخ تر۔

اور وہ اس طرح کہ وہ بچپن ہی میں والدین کے شفیق سائے سے
محروم ہو گئی تھیں باپ نے بوقت دم واپسیں اپنے برادر خورد شکیل احمد کو
وصیت کی تھی کہ ان کی اکلوتی دختر کو کسی قسم کی تکلیف نہ ہونے پائے علینی
پچاس ہزار نقد کے علاوہ کئی مکانوں کی مالک بھی تھیں جو اُن کی ضروریات
کے لئے کافی سے بھی زیادہ تھا چنانچہ شکیل احمد کو بستر مرگ پر لیٹے ہوئے
بھائی کو تسلّی دینے میں کیا عار تھا جب کہ بھتیجی کی جائداد پر اُنھیں
ابھی سے سنہرے خواب نظر آ رہے تھے۔ اگر دولت کا لالچ نہ ہوتا تو شاید
چچا چچی علینی کو پاس تک پھٹکنے کے روادار نہ ہوتے لیکن انہوں نے نئی تجاویز سوچی

جائیں اور ہر وہ ممکن وسیلہ اپنائیں جس کے ذریعہ مظلوم لڑکی کے روپیوں پر غاصبانہ قبضہ
ہو سکے جمیل احمد عینی کا چچازاد بھائی تھا۔ علم سے بے بہرہ اور بے حد تنگ خیال جس کی
سخت گیریوں سے نوکر نالاں تھے اور والدین پریشان۔ اسی پر بس نہیں قماربازی
اور گھوڑ دوڑ سے بھی آپکو انس تھا اور آوارگی سے محبت قلبی۔ ایسے واہیات انسان سے
عینی ایسی لڑکی کو وابستہ کر دینا ایک مجرمانہ ارادہ تھا اور انسانیت سوز فعل مگر
جائیداد پر قابض ہونے کا اس سے بہتر اور کوئی ذریعہ نہیں تھا اس لئے
شکیل احمد اپنے خیال کو عملی جامہ پہنانے پر تیار ہو گئے۔

عینی غریب پر غم و الم کی گھٹا چھا گئی نہ جائے رفتن نہ پائے ماندن والا
معاملہ تھا وہ آج تک جمیل احمد کو اپنا برادر کلاں سمجھتی رہی جس کی نا سمجھی پر
انھیں تعجب تھا اور گرے ہوئے معیار حیات پر تاسف۔ یہی وجہ تھی کہ چچا
اور چچی کی اس سازش سے مطلع ہونے پر وہ وقف یاس ہو کر رہ گئیں اور
اس صدمے کے نتیجے کے طور پر سخت بیمار۔

عینی کی خالہ پروین خانم ایک بیدار مغز اور معزز خاتون تھیں بہن
کے انتقال کے بعد اگرچہ ان کے تعلقات منقطع ہو چکے تھے تاہم اپنی یتیم بھانجی
کی وجہ سے وہ یہ سلسلہ قطعی طور پر ختم نہ کر سکیں عینی کا انھیں از حد خیال تھا
اور اُنکی بیچارگی کا احساس۔ ہر دوسرے تیسرے مہینے وہ اُنھیں اپنے پاس بُلا لیا
کرتیں تا حد امکان غم غلط کرنے کی کوشش کرتیں اور ہر وقت اس امر کی

کوشاں رہتیں کہ انکی مرحوم بہن کی نشانی دنیا میں پُر مسرت زندگی بسر کرسکے
علینی کی علالت کی خبر نے انھیں مضطرب کر دیا اور جمیل سے منسوب
کئے جانے کی مبہم اطلاع نے پریشان۔ وجہ حیرت بھی بجا تھی۔ بھتیجی کی عادات سے
واقف ہو کر علینی کے والد مرحوم جب اسکے مستقبل سے پریشان ہو گئے تو یہ
سوچ کر کہ کہیں بعد میں غریب لڑکی کو تختہ مشق نہ بنایا جائے انھوں نے اپنی
بھتیجی دختر کی (جو اس وقت محض آٹھ برس کی تھی) اپنے ایک دوست کے
لڑکے شاہد طرزی سے نسبت کر دی تھی جو کہ اک ہونہار اور خوشرو تیرہ سالہ
لڑکا تھا۔ بیحد ذہین اور علم کا حد درجہ دلدادگی تک شوقین۔
اور آج دس سال کے بعد اس نسبت کو چھڑایا جا رہا تھا اور وہ بھی
طرزی کی غیر حاضری میں جبکہ وہ سات سمندر پار تعلیم کی تکمیل کے لئے
گیا ہوا تھا۔ اس کے بوڑھے والد بھی فرزند کی غیر حاضری میں انتقال کر چکے
تھے اسلئے کوئی رکاوٹ نہ دیکھ کر ہی شکیل احمد کی بن آئی۔ علینی آج تک
طرزی کی واپسی کے دن گنتی رہیں اور اب جبکہ انکے آنے میں محض چھ ماہ
رہ گئے تھے تو یہ افتاد آپڑی۔
علینی کی علالت کی ایک وجہ یہ بھی تھی اور پروین خانم اس سے
پوری طرح واقف تھیں تاہم بیچاری کر ہی کیا سکتی تھیں ماسوا اس کے
کہ تبدیلی آب و ہوا کے لئے چند روز کہیں باہر لے جائیں۔ شکیل احمد کو یہ

ربط وضبط پسند نہیں تھا مگر خالہ اور بھانجی کی ایک دوسرے کیلئے
وارفتگی بھی مدنظر تھی اس لئے کچھ کہنے کی ہمت نہ پڑتی تھی
پروین خانم علینی کو لے کر سیدھی کشمیر آگئیں اور گزشتہ ایک
ماہ سے یہاں ہی مقیم تھیں لیکن ادھر تو یہ ہوا کہ شکیل احمد کی پھیلائی
ہوئی افواہیں لوگوں میں مشہور ہونے لگیں اور ادھر طرزی نے نہ
معلوم کس وجہ سے خط وکتابت ہی بند کردی علینی تو پہلے ہی پژمردہ تھیں
اب ان مبہم تفکرات سے اور بھی ملول خاطر رہنے لگیں۔
جس ہستی پر اس قدر بھروسا تھا جب وہ ہی بے پرواہ ہوگئی تو
جتنا بھی رنج ہوتا کم تھا یہاں تک کہ علینی کو یقین کامل ہوگیا کہ طرزی
اب کسی اور کے ہوگئے ہیں اس لئے وہ انھیں بھول جانے کی کوشش
کرتیں مگر لاحاصل۔ اور یہ سعی ناکام ہو کر رہ جاتی کیونکہ دس سال تک
جسے اپنا سمجھا تھا اسے اب غیر قرار دیکر فراموش کردینا ناممکن تھا!
قطعی ناممکن!! اور یہاں یہ حالت تھی کہ ؎

جو صبا چمن سے آئی وہ نوید پھر نہ لائی
کہ خزاں رسیدہ دل پر اثر بہار ہوتا

نوبت یہاں تک آپہنچی تھی کہ علینی سے میری بھی واقفیت ہوگئی اور ہم
خیال ہونے کی وجہ سے بہت جلد دوستی میں تبدیل ہوگئی چنانچہ

اس ترنڈ آکر اُکو اُنکے بوٹ میں جاتے دیکھ کر میں اسی وجہ سے پریشان ہو گئی تھی کہ نہ معلوم آج کیسی طبیعت ہو گی۔ گزشتہ چند روز سے زیادہ مصروف رہنے کی وجہ سے میں انھیں دیکھ ہی نہ سکی تھی اسلئے اور بھی فکر ہو رہا تھا۔ بہرحال جا کر حالت جو دیکھی تو میرا اندیشہ پورا ہو رہا تھا۔ علالت آج خطرناک صورت اختیار کر رہی تھی اور وہ بھی چچا کی طرف سے آمدہ خط کی بنا پر جسنے مظلوم لڑکی کی جان پر بنا دی۔ خط میں لکھا تھا "جمیل احمد سے علینی کی شادی کی تاریخ مقرر کر دی گئی ہے اس لئے ایک ہفتہ کے اندر اندر پہنچنے کی کوشش کی جائے"

میں علینی کی صورت دیکھ کر حیران سی رہ گئی اللہ اکبر! وہ چند ہی روز میں کتنی بدل چکی تھیں اسوقت انکا چہرہ کسی بنت البحر کے بالوں کی طرح زرد و زرد تھا اور نرگسی آنکھوں کے گرد رنج و غم کا ہالہ! کمرے کی اندوہ فزا خاموش فضا نے مجھے اور بھی متاثر کیا اور علینی کی حالت نے متاسف!! خالہ روبی ایک کونے میں بیٹھی رو رہی تھیں کافی دیر تک انھیں تشفی دینے کے بعد ڈاکٹر کی تشخیص کی بابت دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ انکی رائیں بڑھتے ہوئے تفکرات سے مریضہ کا دل کمزور ہو چکا ہے احتیاط لازمی ہے کہ آئندہ انھیں کسی قسم کا صدمہ نہ ہونے پائے ورنہ بصورت دیگر فوری ہلاکت کا اندیشہ ہے

کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اب کیا کیا جائے؟ علینی کی علالت کے ساتھ ساتھ شادی کی تاریخ بھی نزدیک آ رہی تھی اور اُن کی حالت سے تو صاف ظاہر ہی تھا کہ

وہ محض اسکے تصور ہی سے گھبرا رہی ہیں اب موقع تھا کہ خالہ پروین اس معاملہ میں کچھ دخل دیں اگر انھیں کچھ پس وپیش تھا بھی تو اپنی عزیز بھانجی کی یہ حالت دیکھ کر رفع ہو گیا اور انھوں نے شکیل احمد کو ایک مدلل خط تحریر کیا جس میں اُنکی موجودہ روش پر ملامت کرتے ہوئے لکھا تھا کہ علینی کے اس قدر درپئے آزار ہونے کا آخر مقصد کیا ہے؟ نیز اُنکی حریص طبعیت کا اندازہ لگاتے ہوئے یہ بھی لکھا تھا کہ اگر کوئی طریقہ ایسا اختیار کیا جائے جس سے آپس میں باعزت طور پر سمجھوتہ ہو جائے نیز علینی غریب کو بھی روحانی اذیت سے نجات ہو تو اس کے عوض میں وہ ہر ایسی چیز دینے کو تیار تھیں جو اُن سے طلب کی جائے اور دسترس سے باہر نہ ہو

شکیل احمد کی طرف سے جواب آنے میں دیر نہ لگی۔ خط کیا تھا حضرت کی شیطنت اور ہوا وہوس پر مہر تقین ثبت تھی لکھا تھا کہ "اگر علینی جائداد سے دستبردار ہو جائے تو جمیل کی نسبت دوسری جگہ طے کی جا سکتی ہے جہاں سے پانچ ہزار روپیہ اور مل جائیگا لیکن اگر اس سے انکار ہے تو یہ اسلئے شادہ ہی ہے کہ اس کے مرحوم والد کی جائداد پر بھائی کا حق زیادہ ہے اسے ایک حبہ بھی نہ ملے گا" تو گویا کہ

اتنی سی بات تھی جسے افسانہ کر دیا

یہ محض روپیوں کا لالچ تھا جسکی وجہ سے علینی کی زندگی تباہ کی جا رہی تھی

اور اس کا مستقبل تاریک۔

وہ خوشی سے الدین کی جائداد سے دست بردار ہونیکو تیار ہو گئیں جب وہ خود ہی نہ رہے تو انکی دولت کب غم غلط کر سکتی تھی اور خاص کر اس صورت میں جبکہ اسکی وجہ سے ایک بہت بڑی مصیبت سے چھٹکارا مل رہا تھا۔

عینی اگرچہ ایک حد تک بخت تھیں لیکن اسکے ساتھ ہی ایک اور فکر نے غلبہ کر لیا اور وہ یہ کہ اگر طرزی ہوتے اسیر کبھی لوٹ بھی آئے تو کیا وہ کسی ایسی لڑکی کو شریک حیات بنانا پسند کرینگے جو محروم الارث ہے۔ اس میں شک نہیں کہ خالہ پروین کے پاس جو کچھ بھی تھا وہ بھی سب انکی بھانجی ہی کا تھا مگر بقول عینی کے ان کے اور طرزی کے درمیان جو خلیج حائل تھی وہ اب اور بھی وسیع ہو چکی تھی۔

دن اسی طرح بے کیف گزرتے رہے اور اس بے پایاں الم کے باعث عینی کی گھٹتی گھٹتی بیماری پھر سے عود کر رہی تھی مظلوم لڑکی کیلئے فردوس منظر کشمیر دوزخ سے بدتر ہو کر رہ گیا تھا مگر ہنوز طرزی کی کوئی خبر نہ تھی اور نہ ہی ان کی واپسی کی اطلاع۔

خالہ پروین بیچاری کی حالت دیوانوں کی سی ہو رہی تھی وہ عینی کو گھنٹوں عالم سکوت میں کھوئی کھوئی دیکھتیں اور آہ سرد بھر کر خاموش رہ جاتیں کیونکہ اس خلش روحانی کو دور کرنے سے معذور تھیں۔

وہ خاموش سی اُداس رات اصنوبر و دیودار کے درخت برف کا لبادہ اوڑھے ساکت کھڑے تھے پہاڑی جھرنے زبانِ بے زبانی میں تنہائی کے گیت سنا رہے تھے اور جھیلم کی موجیں پُرسکون تھیں یہیں علینی کے قریب ہی بیٹھی انھیں ایک دلچسپ افسانہ سنا رہی تھی تاوقتیکہ وہ قریب قریب سو گئیں۔

نہ معلوم کب تک اسی طرح خاموشی کا عالم رہتا کہ اچانک قریب والے ہاؤس بوٹ سے کسی کے گانے کی آواز آنے لگی جیسے بربطِ حیات پر اضطراری نغمہ چھیڑ دیا ہو آواز میں بلا کا گداز تھا اور یہ دلّا تاثر مدہوش درختوں اور وارفتہ موجوں سے ٹکرا ٹکرا کر یہ آواز ہم تک پہنچ رہی تھی؎

نگہِ کرم کا خواہاں جو میں دل فگار ہوتا
کوئی اور تیر چلتا جو جگر کے پار ہوتا
یہ تمھارا کل کا وعدہ کوئی حشر کا تھا وعدہ
کہ وفا نہ ہونے پر بھی مجھے انتظار ہوتا
مے غم میں لطف کیا ہے یہ مگر عجیب مزہ ہے
کوئی تلخ گھونٹ اُترنا نہیں ناگوار ہوتا
میں چُپ اسرا لگائے ذرا اُسے یہی بہانہ

کہ یہ منہ سے کچھ تو کہتا۔ جو امیدوار ہوتا

نہ زمیں کی طرح پڑتا ترے دل پر اک نشاں بھی
مرا ایڑیاں رگڑنا کہ کہیں مزار ہوتا

ہوئی غم کی آگ پانی کہ جو آنکھ تر ہے ورنہ
جسے دیکھتے ہو قطرہ رہی اک شرار ہوتا

وہ کہیں کہ آرزو کو مری غفلتوں نے مارا
ابھی ہم یہ بات کہتے تو نہ اعتبار ہوتا

ابھی آخری نغمہ فضا میں گونج ہی رہا تھا کہ عینی نے جنھیں میں اب تک خوابیدہ ہی سمجھ رہی تھی زور سے ایک چیخ ماری اور طرزی آہ طرزی!! کہہ کر دوسرے لمحہ بیہوش تھیں۔

معلوم ہوتا ہے کہ یہ آواز گانے والے تک پہنچ گئی تھی کیونکہ وہ حواس باختہ بھاگتا ہوا آیا۔ نگاہِ حیرت سے بیہوش عینی کی طرف دیکھا اور اس کے خوشنما سر کو دونوں ہاتھوں سے تھام کر ہوش میں لانے کی تدابیر میں مصروف ہو گیا۔

میں نے چشم زدن میں پہچان لیا تھا کہ آنے والے صاحب شاہ طرزی تھے کیونکہ انکی تصویر ہر وقت عینی کے سرہانے لٹکی

رہتی مگر تعجب تھا کہ وہ یہاں کب اور کیونکر پہنچا۔
خدا خدا کر کے علینی کو ہوش آیا۔ طرزی کو اس قدر قریب دیکھکر انھیں سخت حیرانی تھی اور شاید اسی وجہ سے آنکھیں دوبارہ بند کرلیں گویا کہ کوئی لطیف خواب دیکھ رہی تھیں اور ڈر تھا کہ یہ سلسلہ ٹوٹ نہ جائے۔
"علینی! میری علینی!! تم یہاں اور اس حالت میں؟" طرزی نے سکوت توڑتے ہوئے کہا۔
"آہ! تو کیا یہ عالم خواب نہیں" علینی کو کچھ کچھ یقین اپنی بیداری کا آرہا تھا "لیکن آپ نے تو مجھے فراموش کر دیا تھا۔ پھر یہاں کیونکر پہنچے"
"تمھیں فراموش کر دینا چہ معنی دارد علینی!" اب حیران ہونے کی باری طرزی کی تھی "تمھیں تو میں ایک لمحہ کے لئے بھی نہیں بھول سکتا تھا مگر افسوس کہ تمھاری طرف سے آمدہ خط نے مجھے سوگوار بنا دیا جیسے آرزوؤں کی کشتی ڈوب کر رہ گئی ہو۔ اور تمناؤں نے سسک سسک کر دم دے دیا ہو"
"خط! کیسا خط؟؟" علینی نے شدت اضطراب سے اٹھتے ہوئے کہا
"وہی جس میں تم نے تحریر کیا تھا کہ یہ نسبت ٹوٹ جائے

تو اچھا ہے کیونکہ تم جمیل احمد کو اپنا رفیق حیات بنانا چاہتی ہو"

"آہ غلط!! میرے طرزی!! یہ صریحاً جھوٹ تھا" علینی آنسو بہاتے ہوئے بولی" یہ سب چچا کی چالبازی تھی۔ اِدھر میں خود پریشان تھی کہ آپ نے خطوط کا سلسلہ کیوں بند کر دیا ہے جو جو روحانی تکالیف مجھے اٹھانی پڑیں وہ بھی اظہر من الشمس ہے"

اور علینی نے رُکتے رُکتے تمام داستانِ الم کہہ سنائی کہ کس طرح انھوں نے محروم الارث ہو کر چچا اور اُن کے فرزند سے پیچھا چھڑایا ہے اور کس بیقراری سے آجتک طرزی کی واپسی کا انتظار کرتی رہیں۔ مگر اُنکی خیریت کی اطلاع نہ پاکر سخت ملول تھیں اور جینے سے بیزار۔

طرزی یہ سنکر نقشِ حیرت بن کر رہ گئے انھیں سب سے زیادہ افسوس اس بات کا تھا کہ آج تک علینی کو سمجھ ہی نہ سکے تھے اور اُنکی طرف سے جعلی خط پاکر بدگمان ہو گئے تھے اور سخت مایوس! اُن کے امتحانات اب سے ختم ہو چکے تھے۔ اب وہ چار ماہ ممالک غیر کی سیاحت کا ارادہ رکھتا مگر اس خط سے اُنکے تمام منصوبے خاک میں مل گئے اور زندگی میں کوئی دلچسپی نہ دیکھ کر قبل از وقت ہی ہندوستان لوٹ آئے تھے اس قدر ہمت نہ تھی کہ شکیل احمد سے مل کر معاملہ کی تہہ تک پہنچ سکتے۔ اس لئے اُداس اُداس عرصہ حیات بسر کر رہے تھے اور اب چند دوستوں کے اصرار پر کل ہی سرینگر

وارد ہوئے تھے مگر علینی کی یاد کہیں بھی قرار نہ لینے دیتی اس لئے یہاں بھی طبیعت پریشان ہی تھی۔

"خیر یہاں تک جو کچھ ہوا وہ ٹھیک ہی تھا" انجام کار طرزی اطمینان کا سانس لے کر بولے "لیکن اگر مجھے پیشتر سے علم ہوتا کہ اپنے گوہر گم گشتہ کو دریائے جہلم سے پاؤنگا تو فوراً ہی نہ چلا آتا"

"لیکن کیا آپ ایک محروم الارث لڑکی کو اپنانا ناپسند کریں گے" علینی نے سخت رنجیدگی کے عالم میں کہا

"اوہ! مجھے تو صرف تمھاری ضرورت ہے علینی! تم جیسے بیش بہا جوہر کے مقابلے میں تو دولت کونین بھی ہیچ ہے"

اور فرط انبساط سے علینی کی حسین آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آئے جنھیں طرزی نے اپنے رومال سے خشک کر دیا میں بھی اس غیر متوقع سے واقعہ سے بے حد مسرور تھی اور خالہ پروین کی مسرت کا تو کچھ اندازہ ہی نہ تھا۔

تقریباً ایک ہفتہ کے بعد علینی قطعاً صحت یاب ہو چکی تھیں چند ہی روز میں وہ طرزی کے ساتھ سلسلۂ ازدواج میں منسلک ہو گئیں اور اب تک یہ حسین جوڑا کشمیر میں ہی مقیم ہے اور صحیح معنوں میں لطف حیات اٹھا رہا ہے۔

خالہ پروین مصر ہیں کہ شکیل احمد سے جائداد کا مطالبہ کیا جائے
وہ جائداد جس کی یاد سے اس قدر تلخیاں وابستہ ہیں مگر طرزی و
عینی ؎ خاک بر سر کن غم ایام را ......
کہہ کر گفتگو کا موضوع ہی بدل دیتے ہیں کیونکہ وہ اسی حال میں خوش
ہیں اور موجودہ معیارِ حیات پر قانع ۔

پاداشِ عمل

حیاتِ فانی کی وہ یادگار رات! ہر چہار طرف اک مہیب سا سکوت چھا رہا تھا جیسے فضا میں غیر مرئی روحیں سانس لے رہی ہوں آسمان پر سیاہ بادل چھا رہے تھے اور کسی شب بیدار پرندے کی آواز ماحول کو اور بھی ڈراؤنا بنا دیتی۔

میں نے کچھ دیر پیشتر ایک دہشت ناک افسانہ پڑھ کر ختم کیا تھا جس کے اثرات اب تک دل و دماغ پر حاوی تھے لیکن بلند معلوم تھا کہ آج شب اسی قسم کا ایک افسانہ حقیقت اختیار کرے گا...... جس کا انجام ایسا المناک ہوگا اور کبھی نہ قبول سکنے کی حد تک تلخ۔

گزشتہ چند دنوں سے میں دادی سنجیدہ کے ہاں مقیم تھی لیکن اس حقیقت کا اعتراف کرنے میں مجھے عار نہیں کہ جب سے یہاں آئی [illegible] گزر رہے تھے اور باوجود دادی سنجیدہ کی

دلجوئی کے آداب تھے۔ وجہ محض یہ تھی کہ موصوفہ عادات متضاد کا مجموعہ تھیں اگر کسی لمحے وہ حلیم اور بُرد بار نظر آتیں تو صرف کچھ دیر کے بعد ہی مجسمۂ قہر و غضب اور بیحد تلوّن مزاج بن جاتیں۔ ملازم غریب ہر وقت سہمے سہمے رہتے یہاں تک کہ اُن کے سامنے بات تک کرنے سے انھیں جھجک ہوتی کہ معلوم کونسا امر خلافِ مزاج ثابت ہو اور جلد یا بدیر جُرمانے کی صورت اختیار کرلے۔

تاہم باوجود ان کمزوریوں کے وہ مجھ پر بیحد مہربان تھیں قدرت نے بہت چھوٹی عمر میں مجھے سایۂ مادری سے محروم کردیا تھا اس وجہ سے وہ اور بھی شفقت سے پیش آتیں اور تعطیلات میں بہت اصرار سے بُلا کر اپنے پاس ٹھیراتیں۔

لیکن اس مرتبہ تو اُن کا بُلانا بالکل غیر متوقع تھا اور خلافِ اُمید! اور اس کا سبب یہ ہوا کہ دادی سنجیدہ گزشتہ دنوں کسی دماغی عارضے میں مبتلا ہو گئی تھیں جس سے اب قدرے آرام تو آچکا تھا مگر سخت نگہداشت کی ضرورت تھی۔ ایک تو اُن کی طبیعت پہلے ہی کسیلی تھی اس پر مستزاد وہ پُراسرار بیماری! بیحد چڑچڑے مزاج بن گئیں جس کی وجہ سے مجھے یہاں ٹھیرنے میں سخت دقت ہو رہی تھی اور بورڈنگ سے چلے آنے پر پریشانی۔

اور آج کی شب تو دادی سنجیدہ کی وحشت کا کچھ ٹھکانا ہی نہ تھا! اپنے سائے تک سے بار بار چونک اٹھتیں۔ پتوں کی سرسراہٹ سے متوحش ہو جاتیں اور جھینگروں کی بے معنی آوازوں پر لرزہ براندام۔

اوّل تو وہ افسانہ ہی ایسا دہشت ناک تھا اور اس پر مستزاد دادی سنجیدہ کی پُراسرار حرکات! میں بُری طرح گھبرا رہی تھی۔ دل پر اک نامعلوم سی اُداسی ہالہ کئے ہوئے تھی اور دماغ تو جیسے کچھ سوچنے ہی سے رہ گیا ہو۔

گھنٹے نے دفعتاً دس کا گجر بجایا۔ دادی سنجیدہ بیٹھی بیٹھی اُٹھ کر کھڑی ہو گئیں۔ اس وقت ان کی آنکھیں شدّتِ خوف سے پھیل رہی تھیں۔ لب مرتعش تھے اور چہرہ پُراز یاس۔

"آہ دادی پیاری! آخر بات کیا ہے؟" میں نے اپنی بڑھتی ہوئی تاب نہ لا کر کہا "آخر آپ! آپ اس قدر متوحش کیوں ہیں"

"کیوں کر متوحش نہ ہوں لڑکی! جب کہ اُس کے آنے میں محض دو گھنٹے رہ گئے ہیں۔ آہ! دو گھنٹے صرف! اور پھر کون جان سکتا ہے کہ کیا ہو گا؟"

یہ کہتے کہتے دادی سنجیدہ پر تشنج کی سی حالت طاری ہو گئی اور وہ نڈھال ہو کر آرام کرسی پر لیٹ گئیں۔

"آپ کیا کہہ رہی ہیں دادی پیاری! کون آرہا ہے۔ کس کے آنے میں صرف دو گھنٹے رہ گئے ہیں اور پھر اُس کے آجانے سے ہوگا کیا؟"
اور میں جھک کر دادی سنجیدہ کی نبض دیکھنے لگی کہ کہیں حالتِ سرسام میں تو نہیں چلا رہیں"
"میں بیمار نہیں ہوں لڑکی!" جذبۂ وحشت لمحہ بہ لمحہ ترقی پذیر تھا
"مجھے تو صرف اُس سے ڈر لگتا ہے۔ اُس کے نام تک سے نفرت تلبی ہے اور اور اُسکی آمد کے احساس سے وحشت" (اور پھر گھنٹے کی طرف دیکھتے ہوئے)
معبود! بلند معبود!! اب ڈیڑھ گھنٹہ رہ گیا ہے۔ اور پھر! پھر!!
"اور پھر کیا ہوگا۔ آہ آپ مجھے بتاتی کیوں نہیں دادی سنجیدہ!" اور شدتِ غم و غصہ سے میں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی'
"میرے بتانے کی تو کوئی ضرورت ہی نہیں رہیگی راز بیٹی! یہ سب کچھ تمہیں خود ہی معلوم ہوجائیگا۔ پر آہ تم دہل تو نہ جاؤگی۔ اپنی بد نصیب دادی کی شامتِ اعمال کو اس صورت میں ظاہر ہوتے دیکھ کر چیخ تو نہیں اُٹھوگی؟"
دادی سنجیدہ کی تمام گفتگو میرے لئے اک معمے سے کم نہیں تھی
اس لئے تھک [illegible] سے سامنے لٹکتے ہوئے کلنڈر کی طرف تکنے لگی
تاکہ توجہ کچھ تو اِدھر اُدھر مبذول ہوسکے۔
مگر اُف! میرا کلنڈر کی طرف دیکھنا ہی ستم ہوگیا۔ دادی سنجیدہ

بوکھلائی ہوئی اٹھیں۔ کلنڈر کو دیوار سے اتار کر پُرزے پُرزے کر دیا۔ اسی
پر بس نہیں۔ اِن پُرزوں کو ہوا میں منتشر کر دینے پر بھی انھیں قرار نہیں
تھا۔ میں اک اندازِ بے بسی میں یہ سب کچھ دیکھ رہی تھی مگر کچھ کر سکنے سے معذور تھی۔

"تم میرے جلی حروف میں لکھے ہوئے نامۂ اعمال کو پڑھنا چاہتی
تھیں۔ راز" کچھ دیر کے بعد دادی سنجیدہ تھرتھراتی ہوئی آواز میں بولیں
"مگر کیا میں کہہ نہیں چکی کہ یہ سب کچھ تھوڑی دیر کے بعد ظاہر ہو جائے گا"

"میں تو صرف کلنڈر کی طرف دیکھ رہی تھی دادی پیاری!"
میں اُن کی غلط فہمی کا ازالہ کرتے ہوئے بولی۔ اُلجھن لمحہ بہ لمحہ ترقی پذیر
تھی اور روح پر نامعلوم سی وحشت حاوی۔

"آہ یہ ٹھیک ہے مگر اسی کلنڈر پر تو آج کی تاریخ درج
تھی۔ اُف آج کی تاریخ۔ جب۔ جبکہ"۔۔۔۔ اور الفاظ
وفورِ جوش سے مرتعش آواز میں پھسل کر رہ گئے۔

باوجود سخت ضبط کے بھی میری آنکھوں سے مسلسل آنسو بہہ رہے
تھے۔ روح جیسے خاکستر ہوئی جا رہی تھی اور قلبِ افسردہ ٹکڑے ٹکڑے۔ یہ
حالت نہ معلوم کب تک رہی کہ دادی سنجیدہ کے ان الفاظ نے مہرِ سکوت کو توڑ دیا

"تم رو رہی ہو راز! مگر یہ قبل از وقت ہے کیونکہ
ابھی زردی ہی سرخ یہ کم کم ابھی سے رو لیں سارے رحم دم دیکھا جو پسند رہی تب غم تو پھر ہو گا نہیں ہو گا

آخری الفاظ بھی دادی سنجیدہ پوری طرح ادا بھی نہ کر سکی تھیں کہ گھنٹے نے بارہ بجے کا گجر بجانا شروع کیا اور اُف معبود! وہ قیامت خیز لمحہ دادی سنجیدہ قدرے لڑکھڑائیں۔ اُنکی وہ ڈراؤنی اور قلب کو منجمد کر دینے والی چیخ میں کبھی نہیں بھول سکتی اور ساتھ ہی خانہ باغ سے مدھم سی کراہٹ شروع ہو گئی جو بڑھتے بڑھتے آہوں۔ اسکے بعد سسکیوں اور پھر نوحوں میں تبدیل ہو گئی جیسے فضاؤں میں جگر کاٹتی ہوئی روحیں مصروفِ گریہ و ماتم ہوں۔

مجھے اپنے احساسات پر تاریکی کا پردہ پڑتا ہوا معلوم دیا اور کئی گھنٹوں کی مسلسل بیہوشی کے بعد جب حواس قدرے سکون پذیر ہوئے تو صبح کی دھندلی شعاعیں پیرتی ہوئی کمرے میں داخل ہو رہی تھیں۔ آبی جانور ساحل کے آس پاس چلا رہے تھے اور بوڑھا سمندر سُریلی آوازمیں کوئی گیت گا رہا تھا۔

"معبود کا ہزار شکر ہے خاتون راز! کہ آخر آپ تو ہوش میں آگئیں۔ قریب ہی کھڑے بابا فوزی کہہ رہے تھے۔ ورنہ ہم کو تو ڈر تھا کہ خاتون سنجیدہ کی طرح آپ بھی..." اور جملہ ختم کرتے کرتے وہ وہ خاموش ہو کر رہ گئے جیسے کہ یہ الفاظ بھی بے خبری کی حالت میں زبان سے نکل گئے تھے۔

"دادی سنجیدہ اب کیسی ہیں؟" گزشتہ شب کی یاد میرے دل میں پھر سے عود کر رہی تھی۔ "تم اسطرح متردد کیوں ہو رہے ہو بابا فوزی" اور دادی کی خوابگاہ سے ڈاکٹر کو نکلتے دیکھ کر میں تفتیش حال کے لئے اُن کے پاس جانے لگی۔

"آپکو تو آرام کی سخت ضرورت ہے خاتون راز! ازراہِ کرم خاموشی سے لیٹی رہیئے۔ قدرت کے ہر کام میں ہمیشہ کوئی نہ کوئی راز مضمر ہوتا ہے"

"تو کیا میری دادی اَماں" در و دیوار مجھے گھومتے نظر آنے لگے اور شدتِ گریہ سے الفاظ حلق میں ہی اٹک کر رہ گئے"

"جی ہاں۔ وہ دل کی حرکت بند ہو جانے کی وجہ سے انتقال کر چکی ہیں اور اسکے لئے مجھے آپ سے قلبی ہمدردی ہے مگر ذرا سوچئے تو سہی کہ موصوفہ عمرِ طبعی کو پہنچ گئی تھیں اور ہم سب کے لئے ایک وقت مقرر ہے لیکن میں اسوقت کچھ سوچنے کے لئے تیار نہیں تھی۔ غریب اور بیچاری دادی سنجیدہ۔ اللہ اُن کی موت کیسی پُر اسرار تھی اور کسقدر دہشتناک ایک ایک کر کے مجھے شبِ گزشتہ کی تمام باتیں یاد آ رہی تھیں۔

"خاتون راز! بڑی بیگم نے مجھے کل ایک ملفوف خط دیا تھا اور تاکید کر دی تھی کہ آج صبح سے پیشتر آپکو نہ دیا جائے اگر آپ اپنی حالت میں کچھ افاقہ محسوس کرتی ہوں تو پڑھ کر دیکھ لیجئے"... بابا فوزی نے

گفتگو کا موضوع بدلتے ہوئے کہا

میں نے خط پڑھنے پر آمادگی ظاہر کی اور کانپتے ہوئے ہاتھوں سے لفافہ کھول کر پڑھنے لگی۔ لکھا تھا "راز بیٹی! جس وقت تم سطور ہذا پڑھ رہی ہوگی۔ میری بھٹکتی ہوئی روح اپنی جائے پر پہنچ چکی ہوگی۔ میرے رویہ پر اتنا عرصہ تمہیں تعجب رہا اور بجا۔ مگر اب وقت آچکا ہے کہ تمام راز طشت از بام کر دیا جائے"

میری غصیلی سخت اور جابر طبیعت سے تم واقف ہی ہو اور آہ! کہ اسی کی وجہ سے دنیا میرے لئے اک دہکتا ہوا انگارہ بنکر رہ گئی تھی اور اگر خدا کی رحمت شریک حال نہ ہوئی تو شاید آخرت بھی۔

آج سے چار ماہ پیشتر کا ذکر ہے کہ جنوری کا مہینہ تھا اور یہی تاریخ آف یہی منحوس تاریخ جب کہ میں یہ سطور تحریر کر رہی ہوں۔

رات کی تاریکی زندوں پر چھا چکی تھی فضا پر موت کی قلمرو کا سکہ چل رہا تھا اور کہیں قریب ہی اُلو بھی آنکھیں چیخیں مار رہا تھا۔

سردی کا یہ عالم تھا کہ باوجود کشمیری دوشالوں اور دھاریوال کے کمبلوں میں لپٹے ہوئے ہونے کے بچہ میں سردی سے کپکپا رہی تھی ناچار تنگ آکر آمنہ (آف یہ نام لکھتے ہوئے میرا ہاتھ کانپ رہا ہے) کو آواز دی کہ آکر مجھے لحاف بھی اڑھا دے۔ اسے شاید آنے میں کچھ دیر ہو گئی۔

کم از کم مجھے تو ایسا ہی محسوس ہوا۔ اب بھلا ناراضگی کا کیا ٹھکانا تھا
اس وقت مجھ میں نہ معلوم اتنی قوت کہاں سے آگئی۔ غصّے سے تھرتھراتی
ہوئی اٹھی اور یہ لکھتے ہوئے مجھے شرمندگی محسوس ہوتی ہے (اگرچہ اب
شرمندہ ہونا بھی بعد از وقت ہے) کہ اس امر کا ذرّہ بھر بھی احساس نہ
ہوا کہ وہ اپنے ننھے بچّے کو بہلا رہی تھی جو کہ شدّتِ سرما سے سخت بخار میں
مبتلا تھا اور اپنے مکان سے فوراً نکل جانے کے لئے کہا۔ ایلینہ نے ہاتھ
جوڑے، خوشامدیں کیں اور اپنے بچے کی زار و نزار حالت دکھائی مگر
بے سود! مجھ پر تو اسوقت غصّے کا بھوت سوار تھا اس وقت تک قرار نہ لیا
جب تک اُسے دیگر ملازمین سے کہہ کر گھر سے باہر نہ کرا دیا۔ ان سب کو
ایلینہ سے ہمدردی تھی مگر میرے حکم سے باہر ہونے کی بھی تو جرأت ہی نہ تھی

اس سے فارغ ہو کر "حسن کم جہاں پاک..." کہتی ہوئی میں
اپنی خوابگاہ میں چلی آئی اور شاید آدھ گھنٹہ ہی سو سکی ہونگی کہ خانہ
باغ سے آتی ہوئی مدھم سی چیخوں نے مجھے بیدار کر دیا۔ یہ ایک نئی اور
عجیب بات تھی۔ ابھی اس کی اصل وجہ پر غور ہی کر رہی تھی کہ باتوزی
نے آکر بتایا کہ یہ ایلینہ کی آواز ہے جو اپنے مردہ بچّے کے لئے دیوانہ وار باغ
میں جگر کا شار رہی ہے۔ اُسکی وہ خوفناک چیخیں! اللہ! ایسا معلوم ہوتا تھا
کہ رنج و الم کی دیوی اپنے زرد برلبطپر کوئی مرثیہ سُنا رہی ہے۔

دیوانی اینہ آج بھی زندہ ہے۔ میں اس کے بچے کی قاتل تھی اس لئے وہ بھی شاید انتقام پر مصر ہے اور ہر ماہ ٹھیک اسی تاریخ کو اور اسی وقت یہاں آجاتی ہے جب کہ اسکے مریض بچے نے بخار میں بلبلاتے ہوئے سرما کے سرد جھونکوں سے دم توڑ دیا تھا۔

میری ہر ممکن سعی بھی اسے یہاں سے ہٹانے میں کامیاب نہیں ہو سکی۔ ہر لمحہ کی دہشت اور ناگزیر خوف میرا خاتمہ کر رہا تھا مگر دھیرے دھیرے کوئی مخفی سی طاقت۔ شاید آمنہ کا جذبہ انتقام ہی کہہ رہا ہے کہ آج رات کو میری حیات کا ڈراپ سین ہو جائے گا۔ کاش! اے کاش!! بعد از مرگ تو مجھے سکون نصیب ہو سکے۔"

دادی سنجیدہ کے انتقال کو آج کئی ماہ ہو چکے ہیں وہی مکان ہے اور وہی اس کے مکین لیکن اب کبھی وہ چیخیں نہیں سنائی دیتیں اور نہ ہی دیوانی اینہ کبھی نظر آئی ہے شاید جذبۂ انتقام کو پورا ہوتے دیکھ کر وہ مطمئن ہو گئی تھی اور اب دہر میں بھٹکنے کی ضرورت نہ سمجھتے ہوئے اپنے بچے کے پاس پہنچ گئی ہو

پرنٹر آدم علی غلام حسین نے [illegible] آرٹ پریس [illegible] میں چھاپا۔